حضرت یوسف علیہ السّلام کی سرگزشت

(پر)

بحیثیت مجموعی ایک نظر

فہرست

حضرت ابراہیم کا قبیلہ

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار سال پہلے دنیا کے نقشہ کا یہ حال تھا کہ سرزمین مصر وقت کے تہذیب و تمدن کا مرکز بن چکی تھی۔ لیکن اس کے اطراف و جوانب کی قومیں ابھی تمدن و حضارۃ سے آشنا نہیں ہوئی تھیں اور صحرا نشینی و بدویت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مصر سے ایک قریب تر علاقہ وہ تھا جو آگے چل کر فلسطین کے نام سے مشہور ہوا، اور جسے خاکنائے سینا نے سرزمین افریقہ سے ملا دیا ہے۔ اس علاقہ کی تمام پچھلی آبادیاں مٹ چکی تھیں، اب محض ایک صحرائی علاقہ تھا جو مویشیوں کے لئے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ اور مختلف بدوی قبائل وہاں بود و باش رکھتے تھے۔ انہی قبائل

میں سے ایک چھوٹا سا قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کا بھی تھا۔

حضرت ابراہیم کا ظہور تمدن قدیم کے ایک دوسرے مرکز یعنی سرزمین دجلہ و فرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان میں مقیم ہو گئے۔ کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت کی مغربی جانب واقع ہے اور دریائے یردن سے سیراب ہوتا ہے تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی الٰہی سے منتخب کیا تھا اور اللہ نے فرمایا تھا۔ "تو جس جگہ کھڑا ہے اُس کے چاروں طرف دیکھ۔ یہ تمام ملک میں تجھے اور تیری نسل کو دوں گا اور تیری نسل کو میں خاک کے ذرّوں کی مانند بنا دوں گا۔ اگر کوئی خاک کے ذرّوں کو گن سکتا ہے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔"

قرآن نے بھی جا بجا اس بشارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب حضرت ابراہیم یہاں مقیم ہو گئے تو وقتاً فوقتاً انھیں اور بشارتیں بھی ملتی رہیں۔ ان تمام بشارتوں کا ماحصل یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اُمتوں کا پیشوا، نسلوں کا مورث اور بادشاہوں کا جد بنایا ہے

اور ان کی نسل کو اپنی برکتوں کے لئے چُن لیا ہے۔ جب تک ان کی نسل ظلم و ضلالت سے آلودہ نہ ہوگی وعدہ کی برکتوں کی مستحق رہیگی۔ یہ بشارتیں اس خاندان میں اللہ کا "عہد" سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی اللہ کا وعدہ جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ خاندان کا ہر بزرگ اسے محفوظ رکھتا اور پھر اپنے وارث کو اس کی وصیت کرتا۔

یہ "عہد" دو باتوں پر مشتمل تھا۔

ایک یہ کہ نسل ابراہیمی اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور اس کی دعوت دے گی۔

دوسری یہ کہ اللہ اسے برکت دے گا اور اس کی دعوت کامیاب ہوگی۔ قرآن نے ان تمام بشارتوں کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ بقر کی آیت ۱۲۴۔ اور ہود کی آیت ۷۱ میں دو بشارتیں گزر چکی ہیں۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت ابراہیم کو ایک خاص واقعہ کی خبر دی گئی تھی یعنی یہ کہ ــــــ "تیری اولاد ایک ایسے ملک میں جائے گی، جو اُن کا ملک نہ ہوگا، وہاں لوگ اُسے غلام بنالیں گے اور وہ چار سو برس تک وہاں رہے گی۔"

حضرت ابراہیم سے حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔

حضرت اسمٰعیل حجاز میں بس گئے اور حضرت اسحٰق کنعان میں خاندان کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحٰق سے یعقوب پیدا ہوئے۔ یہ پہلے حاران گئے تاکہ اپنی خالہ زاد بہن سے نکاح کریں۔ پھر بیس برس کے بعد کنعان واپس آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ تورات میں ہے۔ کہ اللہ نے نسل ابراہیمی کا "عہد" ان سے تازہ کیا تھا اور قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔

فلسطین کے تمام علاقہ کی طرح حضرت یعقوب کے خاندان کی زندگی بھی بالکل بدویانہ زندگی تھی۔ مویشی چراتے تھے اور ان کے گوشت، اُون اور دُودھ پر گزران کرتے تھے۔

لیکن اس علاقہ سے تھوڑے فاصلہ پر مصر کی سرزمین تمدن وحضارۃ میں شہرۂ آفاق ہو رہی تھی اور ایک بڑی مملکت کی پائے گاہ تھی۔ اس کا دارالحکومت "رعمسیس" وقت کے علوم وصنائع کا مرکز تھا اور وہاں کے باشندوں میں شہریت وامارت کی خصوصیتیں نشو ونما پا چکی تھیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے اور اطراف

دجوانب کے بدویوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ خصوصاً کنعانی اور عبرانی ان کی نگاہوں میں بڑے ہی ذلیل تھے۔ وہ اُنھیں چرواہا کہہ کر پُکارتے اور اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں جگہ دیں یہ بات بھی اُن میں عام تھی کہ کوئی مصری کنعانی کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہ کھاتا اور پھر مصر کے دیہاتی بھی انھیں اس درجہ بُرا سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں اُن کا بسنا گوارا نہ کرتے۔

قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی

لیکن قدرتِ الٰہی سے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا ——
کنعان کے اِس بدوی قبیلہ کا ایک کم سن لڑکا بغیر اپنی خواہش اور مرضی
کے مصر پہنچ گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد دنیا نے دیکھا کہ اس عظیم الشان
مملکت کی حکومت کی باگ اسی کنعانی کے ہاتھوں میں ہے اور بادشاہ
سے لے کر مصر کی ادنیٰ رعایا تک سب اس کی عظمت وفضیلت کے
آگے جھکے ہوئے ہیں۔

گویا وقت کی سب سے بڑی پرشوکت، سب سے بڑی متمدّن
سب سے بڑی معزز مملکت کے تختِ حکمرانی پر اچانک کون آپہنچ گیا؟
اسی بدوی قبیلہ کا ایک چرواہا۔ جسے اس متمدّن آبادی کا ہر فرد

نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

اور پھر یہ عجیب و غریب معاملہ کن حالات میں ظہور پذیر ہوا؟ ایسے حالات میں جو اصل معاملہ سے بھی کہیں زیادہ عجیب و غریب تھے۔

حضرت یعقوب کے بارہ لڑکے تھے۔

چھ۶ لیاہ سے :۔ روبن۔ شمعون۔ لاوی۔

یہوداہ۔ اشکار۔ زبلون۔

دو۲ بلہاہ سے : دان۔ نفتالی

دو۲ زلفہ سے : جد۔ آشر

دو۲ راخل سے : یوسف۔ بن یمین۔

یوسف اور بن یمین سب سے چھوٹے تھے۔ اور بن یمین کی پیدائش کے بعد ماں کا انتقال ہو گیا۔

پس گھرانے میں چودہ آدمی رہ گئے تھے۔ بارہ لڑکے، باپ اور اُن کی ایک بیوی۔

توارات میں ہے کہ لیاہ اور راخل میں سخت رقابت تھی اور اُس کا اثر ان کی اولاد میں بھی پوری طرح نمایاں تھا۔

حضرت یعقوب یوسف کو سب سے زیادہ چاہتے تھے، اور یہ
بات سوتیلے بھائیوں پر بہت شاق تھی. اسی لئے حضرت یعقوب
نے روکا تھا کہ اپنا خواب بھائیوں سے نہ کہیؤ!

(اور جب ایسا ہوا تھا کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا
تھا" اے میرے باپ میں نے خواب میں دیکھا کہ
گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند، اور دیکھا
کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔"

(سورۂ یوسف آیت ۴)

توراۃ میں ہے کہ:۔

" یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی، جب خواب کا
معاملہ پیش آیا۔ خواب میں گیارہ ستاروں سے
مقصود یوسف کے گیارہ بھائی تھے اور سورج چاند
سے باپ اور "سوتیلی ماں"۔ توراۃ میں ہے کہ یوسف
نے بھائیوں سے خواب کہہ دیا تھا اور انھیں یہ بات
بھی معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی تعبیر کیا ہے غالباً

حضرت یوسف باپ کی ممانعت سے پہلے یہ بات ظاہر کر چکے تھے۔

(اور جب ایسا ہوا تھا کہ یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں کہنے لگے۔ ہمارے باپ کو یوسف اور اُس کا بھائی ہم سب سے بہت زیادہ پیارا ہے حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں (یعنی ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔ پس یوسف کو مار ڈالیں، یا کسی جگہ پھینک آئیں تاکہ ہمارے باپ کی توجہ ہماری طرف رہے اور اس کے نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں"

سورۂ یوسف ۹ : ۸)

توراۃ میں ہے کہ جب بھائیوں نے یہ مشورہ کیا تو روبن نے کہا قتل نہ کرو کنوئیں میں ڈال دو۔

اسے سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لئے کنوئیں میں ڈال دو کنواں خشک تھا اور شاہراہ سے الگ۔ اس لئے انہیں یقین تھا کہ کوئی

انسان وہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اتفاق سے ایک قافلہ راہ بھول کر وہاں آنکلتا ہے اور پانی کے لئے ڈول ڈالتا ہے۔ لڑکا سمجھتا ہے میرے بھائیوں کو رحم آگیا۔ اب مجھے نکالنے کے لئے ڈول ڈال رہے ہیں۔ وہ اُس میں بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح اُس کی رہائی کا سامان ہو جاتا ہے۔

لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے جو تھوڑی دیر کی تھی نجات مل گئی۔ لیکن دوسری ہلاکت جو عمر بھر جاری رہنے والی ہلاکت تھی نمودار ہو گئی۔ یعنی بھائیوں نے اسے اپنا بھاگا ہوا غلام ظاہر کرکے قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ وہ اُسے کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ بیچنے کے لئے مصر لے آئے۔

اس طرح مصر میں اس کا داخلہ ایک غلام کا داخلہ تھا۔ اور غلام بھی ایسا جو کم سے کم قیمت میں خریدا گیا اور اب کم سے کم قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ نہ تو بیچنے والے اس کی قدر و قیمت بڑھانے کے خواہشمند تھے نہ اب بازارِ مصر میں اس جنس کی گرانی کا کوئی سامان ہے!

دکھلا کے لے جاکے اسے مصر کا بازار
خواہاں نہیں پر کوئی وہاں جنسِ گراں کا

بہرحال ایک خریدار کی نظر پڑ جاتی ہے یہ اُس کے گھر میں ایک نو خرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے، مگر اپنے حسنِ عمل سے خواجگی و آقائی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

تورات میں ہے کہ جس مصری نے خریدا تھا اُس کا نام "فوطی فار" تھا اور وہ فرعون کا ایک امیر اور سردار فوج تھا۔ قرآن نے بھی آگے چل کر اسے "عزیز" کہا ہے۔ یعنی ایسا آدمی جو ملک میں بڑی جگہ رکھتا تھا۔

عزیز مصر نے پہلے تو خوبصورت غلام دیکھ کر خرید لیا تھا لیکن جب تھوڑے ہی دنوں کے اندر اس پر حضرت یوسف کے جوہر کھُل گئے تو اُن کی راست بازی، نیک عملی اور پاکیٔ نفس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنے سارے گھر بار اور علاقہ کا مختار کل بنا دیا۔ تورات میں ہے کہ یوسف کے حسنِ انتظام سے فوطی فار کی آمدنی دگنی ہو گئی تھی۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو گویا حضرتِ یوسف کی مصری کامرانیوں کی بنیاد پڑ گئی اور وہ میدان پیدا ہو گیا جہاں اُن کے جوہر کھلنے والے اور بتدریج تختِ مصر تک پہنچانے والے تھے۔ پس فرمایا: کذٰلک مکنا لیوسف فی الارض اس طرح ہم نے یوسف کے قدم مصر میں جما دیئے

کہ غلام ہو کر بکا تھا لیکن معزز و محترم ہو کر زندگی بسر کرنے لگا۔

پھر فرمایا: واللہ غالب علیٰ امرہ دیکھو خدا جو کچھ چاہتا ہے کس طرح کر کے رہتا ہے! بھائیوں نے یوسف کو نامراد کرنا چاہا تھا لیکن انھوں نے جو کچھ کیا وہی اس کی فتح و فیروزی کا ذریعہ بن گیا۔

اوپر تورات کی تصریح گزر چکی ہے کہ باپ سے علیحدگی کے وقت ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔ پس سورۂ یوسف کی آیت ۲۲ میں فرمایا، عزیز کے یہاں کئی سال رہنے کے بعد جب وہ جوان ہو گئے تو حکمرانی کی دانش اور علم کی فضیلت مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی اور قانون الٰہی یہ ہے کہ نیک کرداروں کو اسی طرح ان کے حسن عمل کے نتائج ملا کرتے ہیں۔

امتحانِ عصمت

سورۂ یوسف آیت ۲۳ تا ۳۲ :

" اور (پھر ایسا ہوا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی) وہ اُس پر (ریجھ گئی، اور) ڈورے ڈالنے لگی کہ بے قابو ہو کر بات مان جائے۔ اُس نے (ایک دن) دروازے بند کر دیئے۔ اور بولی "لو آؤ" یوسف نے کہا : معاذ اللہ! (مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی) تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اُس نے مجھے عزّت کے ساتھ (گھر میں) جگہ دی ہے (میں اس کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا) اور حد سے گزرنے والے کبھی فلاح نہیں

پا سکتے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے پڑ چکی تھی اور (حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بے قابو ہو کر) یوسف بھی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا اگر اُس کے پروردگار کی دلیل اُس کے سامنے نہ آگئی ہوتی۔ (تو دیکھو) اس طرح (ہم نے انسانی کی اس سخت آزمائش میں بھی اسے دلیل حق کے ذریعہ ہشیار رکھا) تاکہ برائی اور بے حیائی کی باتیں اس سے دُور رکھیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو برگزیدگی کے لئے چُن لئے گئے"۔

اور وہ ایسا ہوا کہ) دونوں دروازے کی طرف دوڑے۔ اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ (یوسف اس لئے کہ عورت سے بھاگ نکلے عورت اس لئے کہ اُسے نکل بھاگنے سے روکے) اور

عورت نے یوسف کا کُرتا پیچھے سے کھینچا اور دو ٹکڑے کر دیا۔

اور پھر (اچانک) دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ تب عورت نے (اپنا جرم چھپانے کے لئے فوراً بات بنالی اور) کہا ــــــ "جو آدمی تیرے اہل خانہ کے ساتھ بُری بات کا ارادہ کرے اُس کی سزا کیا ہونی چاہیئے؟ کیا یہی نہیں ہونی چاہیئے کہ اُسے قید میں ڈالا جائے یا (کوئی اور) دردناک سزا دی جائے؟"

اس پر یوسف نے کہا: "خود اسی نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل پڑوں" (میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا)

اور (پھر ایسا ہوا کہ) اس عورت کے کُنبہ والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی، اُس نے کہا: "یوسف کا کرتا (دیکھا جائے) اگر آگے سے

دو ٹکرے ہوا ہے تو عورت سچی ہے۔ یوسف جھوٹا ہے۔ اگر پیچھے سے دو ٹکڑے ہوا ہے تو عورت نے جھوٹ بولا۔ یوسف سچا ہے۔"

پس جب عورت کے خاوند نے دیکھا کہ یوسف کا کرتہ پیچھے سے دو ٹکڑے ہوا ہے تو (اصلیت پا گیا اور) عورت سے کہا: کچھ شک نہیں یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں۔"

(پھر اُس نے کہا) "اے یوسف! اس (معاملہ) سے درگزر کر (یعنی جو کچھ ہوا، اُسے بھُلا دے) اور (بیوی سے کہا) اپنے گناہ کی معافی مانگ بلاشبہ تو ہی خطاوار ہے۔"

اور (پھر جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں: "دیکھو عزیز کی بیوی

اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اسے رجھالے'
وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی ۔ ہمارے
خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی ہے۔"
جب عزیز کی بیوی نے مکاری کی یہ باتیں
سنیں تو انھیں بلوا بھیجا۔ اور اُن کے لیے
مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے مطابق)
ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کردی (کہ کھانے
میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو)
یوسف سے کہا۔ ان سب کے سامنے نکل آؤ۔
جب یوسف (نکل آیا اور) اُن عورتوں نے
اسے دیکھا تو (ایسا پایا کہ) اُس کی بڑائی کی
قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ
لئے اور (بے اختیار) پکار اُٹھیں۔ "سبحان اللہ!
یہ تو انسان نہیں ہے۔ ضرور ایک فرشتہ ہے'
بڑے مرتبے والا فرشتہ۔"

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
(غالب)

تب (عزیز کی بیوی) بولی "تم نے دیکھا؟ یہ ہے وہ آدمی جس کے بارے میں تم نے مجھے طعنے دیئے تھے۔ ہاں بے شک میں نے اُس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا، مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔ اور (اب اُسے سنا کے کہے دیتی ہوں کہ) اگر اُس نے میرا کہا نہ مانا (اور اپنی ضد پر اڑا رہا) تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے"

تورات میں ہے کہ یوسف خوبصورت اور نورپیکر تھے پس جب جوانی کو پہنچے تو عزیز کی بیوی اُن پر فریفتہ ہو گئی۔ اور جب دیکھا کہ دوسری طرف سے جواب نہیں ملتا تو جلیسا قاعدہ ہے ملتفت کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کام میں لائی۔ پھر جب اس پر بھی وہ نہ پھسلے تو ایک دن جوش فریفتگی میں وہ بات کر بیٹھی جو اس معاملہ کی انتہائی حد ہے۔ یعنی ہر طرح کے موانع جو کسی انسان کو ضبط نفس پر مجبور

کر سکتے ہیں، راہ سے دُور کر دیئے۔ اور کھُلے لفظوں میں طالب و مُصر ہوئی۔

جس شخص نے انکشافِ حقیقت کا طریقہ تبلایا اُسے "شاہد" کہا۔ کیونکہ اُس نے کُرتہ دیکھ کر اصلیت پالی تھی اور حضرت یوسف کی پاکی کی شہادت دی تھی اور پھر ثبوت میں کہا تھا کہ تم خود بھی دیکھ لو، اُن کے کُرتے کا کیا حال ہے؟

یہ کون شخص تھا؟ ــــ خود اس عورت کے عزیزوں میں سے تھا۔ اِس سے زیادہ قرآن نے تصریح نہیں کی۔ کیونکہ جو بات واضح کرنی تھی وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف کی پاکی و راست بازی نے گھر کے تمام آدمیوں کو اُن کا معتقد بنا دیا تھا۔ حتّٰی کہ خود عورت کے ایک رشتہ دار نے اپنی رشتہ داری کا لحاظ نہیں کیا اور یوسف کی حمایت میں سچائی ظاہر کر دی۔

شہر کی ہم درجہ عورتوں میں اس بات کا چرچا ہونا، عورتوں کا بناوٹ اور ریاکاری سے طعن و تشنیع کرنا، عزیز کی بیوی کا

سننا اور ضیافت کی محفل کا سامان کرنا اور حضرت یوسف کی عصمت و پاکی کا اس آزمائش میں بھی بے داغ نکلنا۔

آیت ۳۰ میں جس واقعہ کا ذکر ہے یہ حضرت یوسف کے جمال سیرت کا ایک دوسرا مظاہرہ ہے اور پہلے سے بھی زیادہ عظیم ہے۔

ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اس زمانے کی مصری معاشرت کس درجہ شائستہ ہو چکی تھی؟ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں۔ نشست کے لئے مسندیں لگائی جاتی تھیں۔ کھانے کے لئے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی۔ مسندوں کے اہتمام کا حال اس سے معلوم ہو گیا کہ:

واعتدت لھن متکاً   اور ان کیلئے مسندیں آراستہ کیں

مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مورخوں کی شہادت سے جو حالات روشنی میں آئے ہیں ان سے بھی اس متمدن معاشرت کی تصدیق ہوتی ہے۔ خصوصاً ان نقوش سے جن میں اُمراء کی مجلسوں کا مرقع دکھایا گیا ہے اور جو قرآن کے ان اشارات کی پوری

تفسیر ہیں۔

عزیز کی بیوی کا دھمکی دینا کہ اگر کہا نہ مانوگے
تو قید میں ڈالے جاؤگے اور حضرت یوسف کا
معصیت پر قید کو ترجیح دینا اور قید خانہ میں بھی
تبلیغ حق سے غافل نہ ہونا۔

عزیز پر حضرت یوسف کی سچائی ظاہر ہو گئی تھی۔ اس لئے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ لیکن اس کی بیوی کا عشق ایسا نہ تھا جو اس ناکامی سے سرد پڑجاتا۔ وہ اور زیادہ بڑھ گیا، اور جب دیکھا کہ طلب و الحاح سے کسی طرح کام نہیں بنتا تو سختی پر اُتر آئی اور یوسف سے کہا: یا تو میرا کہا مانو، نہیں تو قیدی ہونے کی ذلّت و رسوائی گوارا کرو،
حضرت یوسف نے کہا، قید خانہ مجھے پسند ہے۔ لیکن راستی سے منحرف ہونا پسند نہیں۔

جب اس زرخرید غلام کے سامنے بہ یک وقت دو باتیں پیش کی گئیں کہ دونوں میں سے جسے چاہے اپنے لئے پسند

کرے۔ نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت و کامرانی اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی و نامرادی۔

پہلی میں نفس کی عشرت مگر حق کی معصیت تھی۔ دوسری میں نفس کی محرومی مگر حق کی اطاعت تھی۔ وہ پہلی سے بھاگتا ہے اور دوسری کے لئے آرزوئیں کرتا ہے۔

پہلی سے اس طرح بھاگتا ہے گویا اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں، دوسری کے لئے اس طرح التجائیں کرتا ہے گویا اس سے بڑھ کر کوئی محبوب شے نہیں۔

رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ !

مصر میں کسی انسان کی ذلّت و نامرادی کے جتنے سامان ہو سکتے تھے اب وہ سب جمع ہو گئے۔

اوّل تو عبرانی قبیلہ کا ایک فرد۔ پھر کیسا فرد؟ زرخرید غلام کیسا غلام؟ جسے اُس کے آقا نے ایک بڑے جرم کا مرتکب پایا، اور سزا کا مستحق تصوّر کیا۔ کیسی سزا؟ قیدخانے میں ڈالے جانے کی سزا، جو ذلّت و خواری اور تعذیب و عقوبت کی بڑی سے بڑی سزا

سمجھی جاتی تھی۔

اب وہ مصریوں کی نگاہ میں قابل نفرت عبرانی بھی ہے، غلام بھی ہے، مجرم بھی ہے —— اور قیدی بھی!

قید خانہ اور تختِ مصر

M.K.R

سورۂ یوسف آیت ۳۵ تا ۵۷

پھر (ایسا ہوا کہ) اگرچہ وہ لوگ (یعنی عزیز اور اُس کے خاندان کے آدمی) نشانیاں دیکھ چکے تھے (یعنی یوسف کی پاک دامنی کی نشانیاں) پھر بھی انہیں یہی بات ٹھیک دکھائی دی کہ ایک خاص وقت تک کے لئے یوسف کو قید میں ڈال دیں۔

اور (دیکھو) ایسا ہوا کہ یوسف کے ساتھ دو جوان آدمی اور بھی قید خانہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (یوسف سے) کہا مجھے (خواب میں) ایسا دکھائی

دیا ہے کہ میں شراب (بنانے) کے لئے (انگور کا عرق) نچوڑ رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا۔ مجھے ایسا دکھائی دیا ہے کہ سر پر روٹی اُٹھائے ہوئے ہوں اور پرندا سے کھا رہے ہیں (اور دونوں نے درخواست کی کہ) ہمیں تبلا دو اس بات کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ تم بڑے نیک آدمی ہو۔

یوسف نے کہا (گھبراؤ نہیں) قبل اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے میں تمہارے خوابوں کا حال تمہیں تبلا دوں گا۔ اس بات کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جو مجھے میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کی ملّت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور آخرت سے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کی ملّت کی پیروی کی ہم (اولاد ابراہیم) ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں۔ یہ (ملّت) اللہ کا ایک فضل ہے

جو اُس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ہیں جو (اس نعمت کا) شکر نہیں بجا لاتے۔

اے یارانِ مجلس (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جُدا جُدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اُتاری۔ حکومت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کرو اور کسی کی نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔ مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اے یارانِ مجلس! (اب اپنے اپنے خوابوں کا مطلب سُن لو) تم میں ایک آدمی (وہ ہے جس نے دیکھا کہ انگور نچوڑ رہا ہے) تو وہ قید سے چھوٹ جائے گا اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔ اور دوسرا آدمی (وہ

ہے جس نے دیکھا، اس کے سر پر روٹی ہے اور پرند روٹی کھا رہے ہیں) تو وہ سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرند اُس کا سر (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔ جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو، وہ فیصل ہو چکی۔ اور فیصلہ یہی ہے۔

اور یوسف نے جس آدمی کی نسبت سمجھا تھا کہ نجات پائے گا، اُس سے کہا "اپنے آقا کے پاس جب جاؤ تو مجھے یاد رکھنا" (یعنی میرا حال اس سے ضرور کہہ دینا) لیکن (جب تعبیر کے مطابق اُس نے نجات پائی تو) شیطان نے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے حضور پہنچ کر اُسے یاد کرتا پس یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہا۔

اور پھر ایسا ہوا کہ (ایک دن) بادشاہ نے (اپنے تمام درباریوں کو جمع کر کے) کہا۔ "میں (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی۔ انہیں سات دُبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں۔ اور سات بالیں

ہری ہیں اور سات دوسری سوکھی۔ اے اہل دربار اگر تم خواب کا مطلب حل کر لیا کرتے ہو تو بتلاؤ میرے خواب کا حل کیا ہے؟"

درباریوں نے (غور و فکر کے بعد) کہا یہ پریشان خواب و خیالات ہیں (کوئی ایسی بات نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو۔) ہم سچے خوابوں کا مطلب تو حل کر دے سکتے ہیں لیکن پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے۔"

اور جس آدمی نے (ان) دو قیدیوں میں سے نجات پائی تھی اور جسے ایک عرصے کے بعد (یوسف کی) بات یاد آئی وہ (خواب کا معاملہ سُن کر) بول اٹھا۔" میں اس خواب کا نتیجہ تمہیں بتلا دوں گا۔ تم مجھے (ایک جگہ) جانے دو۔"

چنانچہ وہ قید خانے میں آیا اور کہا: "اے یوسف! اے کہ مجسّم سچائی ہے! اس (خواب) کا ہمیں حل بتا کہ

سات موٹی تازی گایوں کو سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں سات سوکھی تاکہ ان لوگوں کے پاس واپس جا سکوں (جنہوں نے مجھے بھیجا ہے) کیا عجب ہے وہ تمہاری قدر و منزلت معلوم کرلیں"۔

یوسف نے کہا۔ (اس خواب کی تعبیر اور اس کی بنا پر تمہیں جو کچھ کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ) سات برس تک تم لگاتار کھیتی کرتے رہوگے۔ (ان برسوں میں خوب بڑھتی ہوگی) پس (جب فصل کاٹنے کا وقت آیا کرے تو) جو کچھ کاٹو اسے اُس کی بالوں ہی میں رہنے دو (تاکہ اناج سڑے گلے نہیں) اور صرف اتنی مقدار الگ کرلیا کرو جو تمہارے کھانے کے لئے (ضروری) ہو۔ پھر اس کے بعد سات بڑے سخت مصیبت کے برس آئیں گے جو وہ سب ذخیرہ کھا جائیں گے جو تم نے (اس طرح) پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ مگر ہاں تھوڑا سا جو تم روک

رکھو گے بچ رہے گا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ لوگوں پر خوب بارش بھیجی جائے گی، لوگ اس میں (پھلوں اور دانوں سے) عرق اور تیل خوب نکالیں گے۔"

(جب اس آدمی نے یہ بات پادشاہ تک پہنچائی تو) پادشاہ نے کہا۔" یوسف کو (فوراً) میرے پاس لاؤ۔ لیکن جب (پادشاہ) کا پیام بر یوسف کے پاس پہنچا، تو اُس نے کہا۔ (میں یوں نہیں جاؤں گا) تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور (میری طرف سے) دریافت کرو۔ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا۔ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ (میں چاہتا ہوں پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے) جیسی کچھ مکاریاں انھوں نے کی تھیں، میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے۔"

اس پر پادشاہ نے (ان عورتوں کو بلایا اور) کہا "صاف صاف بتلادو۔ تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا جب تم

تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اُسے اپنی طرف مائل کرلو۔" وہ بولیں: حاشا للہ! ہم نے اِس میں بُرائی کی کوئی بات نہیں پائی۔ (یہ سُن کر) عزیز کی بیوی بھی (بے اختیار) بول اُٹھی۔ "جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہو گئی۔ ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ بلاشبہ وہ (اپنے بیان میں) بالکل سچا ہے۔"

یہ میں نے اس لئے کہا کہ اسے معلوم ہو جائے، (یعنی یوسف کو معلوم ہو جائے) میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی۔ نیز اس لئے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ آدمی کا نفس تو بُرائی کے لئے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا آسان نہیں) مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ

میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

اور پھر بادشاہ نے حکم دیا۔ یوسف کو میرے پاس لاؤ کہ اسے خاص اپنے (کاموں کے) لئے مقرر کردوں۔ پھر جب وہ آیا تو بادشاہ نے کہا۔ "آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار اور امانت دار انسان ہے۔"

یوسف نے کہا: "مملکت کے خزانوں پر مجھے مختار کردیجئے۔ میں حفاظت کرسکتا ہوں اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔ (چنانچہ بادشاہ نے اُسے مملکت کا مختار بنا دیا)

اور دیکھو! اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دئیے کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے۔ ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کردیتے ہیں۔ اور نیک عملوں

کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

اور جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور (بدعملیوں سے) بچتے رہے، ان کے لئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

(۱۱/۲۱۰)

توضیحات

تورات میں ہے کہ جب یوسف قید خانہ میں ڈالا گیا تو قید خانے کا داروغہ اُس پر مہربان ہو گیا۔ اور تمام قیدیوں کا انتظام اُس کے سپرد کر دیا۔ وہ قید خانے کا بالکل مختار ہو گیا تھا اور خداوند نے وہاں بھی اُسے اُس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔

اوّل تو دو قیدیوں کا تعبیر پوچھنا ہی اس کی دلیل ہے کہ انھیں غیر معمولی علم و فضیلت کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ پھر اُن دونوں کا کہنا کہ "ہم دیکھتے ہیں تم بڑے نیک آدمی ہو" صاف طور پر واضح کر دیتا ہے کہ قید خانے میں ان کا تقدس عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

تورات میں ہے کہ ان دو قیدیوں میں ایک بادشاہ کے ساقیوں

کا سردار تھا۔ دوسرا روٹی پکانے والوں کا۔ پادشاہ ان پر ناراض ہوا اور قید خانے میں بھیج دیا۔ یوسف ہر روز قیدیوں کا معائنہ کیا کرتا تھا۔ ایک دن انھیں دیکھا کہ بہت اُداس بیٹھے ہیں۔ سبب پوچھا تو انھوں نے کہا: "ہم نے آج رات کو ایسی ایسی باتیں خواب میں دیکھی ہیں۔

حضرت یوسف کا دو قیدیوں کو اُن کے خواب کی تعبیر بتلانا اور اسی کے مطابق ظہور میں آنا، پھر پادشاہ مصر کا ایک عجیب و غریب خواب دیکھنا اور مصر کے تمام دانشمندوں اور جادوگروں کا تعبیر سے عاجز ہونا اور بالآخر حضرت یوسف کو قید خانہ سے طلب کرنا۔

توراۃ میں ہے کہ حضرت یوسف نے ساقیوں کے سردار کو اس کے خواب کی تعبیر یہ بتلائی تھی کہ تین دن کے اندر فرعون تجھے تیرے منصب پر بحال کر دے گا۔ اور آگے کی طرح تو اُس کے ہاتھ میں شراب کا جام دے گا۔ اور کہا تھا، جب تو خوش حال تو مجھے یاد رکھیو ـــ اور

فرعون سے میرا ذکر کیجیو کہ لوگ عبرانیوں کے ملک سے مجھے پکڑ لائے اور یہاں بھی بغیر کسی قصور کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اور نان پزوں کے سردار سے کہا تھا کہ تین دن کے اندر تیری موت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اور تیری لاش درخت پر لٹکائی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تیسرے دن فرعون کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن سردار ساقی بحال کر دیا گیا۔ مگر نان پزوں کے سردار کو سزا ہوئی۔ لیکن سردار ساقی نے بحال ہو کر یوسف کو یاد نہ رکھا۔ وہ یہ معاملہ بھول گیا۔

چنانچہ حضرت یوسف کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ کئی سال تک قید خانے میں پڑے رہے۔

اس کے بعد وہ معاملہ پیش آیا جس کی طرف آیت ۴۳ میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی پادشاہ مصر نے ایک عجیب طرح کا خواب دیکھا اور جب دربار کے دانشمندوں سے تعبیر دریافت کی تو کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ تورات میں ہے کہ پادشاہ نے تمام حکیموں اور جادوگروں کو جمع کیا تھا مگر کوئی اُس کی تعبیر نہ بتلا سکا۔

یہاں قرآن نے درباریوں کا جو جواب نقل کیا ہے اُس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی تشفی بخش بات معلوم نہ کرسکے تو کوشش کی کہ پادشاہ کے دل سے اس خواب کی اہمیت کا خیال نکال دیں۔ پس انھوں نے کہا یہ کوئی روحانی بات نہیں ہے۔ ویسے ہی پریشان خیالی سے طرح طرح کی باتیں سوتے میں نظر آگئی ہیں۔ لیکن سردار ساقی کو خواب کی بات سن کر اپنے خواب کا معاملہ یاد آگیا۔ اور ساتھ ہی یہ بات یاد آگئی کہ حضرت یوسف نے کیا کہا تھا؟ تب اُس نے اپنا واقعہ پادشاہ کے گوش گذار کیا۔ اور قید خانہ میں جاکر حضرت یوسف سے ملا۔

حضرت یوسف نے فرمایا: سات گایوں سے مقصود زراعت کے سات برس ہیں۔ آئندہ سات برس تک بہت اچھی فصلیں ہونگی یہ گویا سات موٹی گائیں ہوئیں۔ اس کے بعد سات برس تک متواتر قحط رہے گا۔ یہ سات دُبلی گائیں ہوئیں۔ اُنھوں نے موٹی گائیں نگل لیں یعنی فراوانی کو قحط نے نابود کردیا۔ سات ہری بالوں اور سات سوکھی بالوں میں بھی یہی بات واضح کی گئی ہے۔ پھر فرمایا۔ اس

آنے والی مصیبت سے ملک کو کیونکر بچایا جا سکتا ہے؟ اس کی تدبیر یہ ہے کہ بڑھتی کے سات برسوں میں قحط کے لئے اناج ذخیرہ کیا جائے اور اسے اس طرح محفوظ رکھا جائے کہ آنے والے سات برسوں میں ملک کے لئے کفایت کرے۔

یہ قرآن کے ایجاز بلاغت میں سے ہے کہ تعبیر اور تدبیر کو الگ الگ بیان نہیں کیا۔ ایک ہی ساتھ بیان کر دیا، تاکہ تکرار بیان کی حاجت نہ رہے۔

جب سردار ساقی نے حضرت یوسف کا جواب پادشاہ کو سُنایا تو تعبیر اس درجہ واضح اور چسپاں تھی کہ اُس نے سنتے ہی اس کی تصدیق کی اور اُن کی ملاقات کا مشتاق ہو گیا۔ چنانچہ حکم دیا۔ فوراً اُنہیں قید خانے سے نکالا جائے اور دربار میں لایا جائے۔

حضرت یوسف کا مژدۂ رہائی سُنتا مگر قید خانہ چھوڑنے سے انکار کر دینا اور پادشاہ سے کہلانا کہ پہلے میرے قضیہ کی تحقیقات کر لی جائے۔ پادشاہ کا تحقیق کرنا اور اُن کی پاکی و راستی کا آشکارا

ہو جانا، اور عزیز کی بیوی کا اعلان کرنا کہ وہ سچا ہے سارا قصور میرا تھا۔

تعبیر سُن کر پادشاہ کے دل میں حضرت یوسف کا اس درجہ احترام پیدا ہو گیا کہ اُس نے ایک خاص پیام بران کے لانے کے لئے بھیجا جسے آیت ۵۰ میں "رسول" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن حضرت یوسف نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔

انہوں نے کہا۔ میں اس طرح رہا ہونا پسند نہیں کرتا۔ پہلے میرے معاملہ کی تحقیقات کرلی جائے کہ مجھے قید میں کیوں ڈالا گیا؟ اگر میں مجرم ہوں تو رہائی کا مستحق نہیں ہوں۔ اگر مجرم نہیں ہوں تو بلاشبہ مجھے رہا ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے عزیز کی بیوی کی جگہ ان عورتوں کا ذکر کیا جنہوں نے مکاری سے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟

اس لئے کہ:

(۱) قید کے معاملہ میں ان عورتوں کا بھی ہاتھ تھا۔ انھوں نے اپنی ناکامیابی کی ذلت مٹانے کے لئے جھوٹے الزام تراش

لئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قید کا معاملہ اُن کے معاملہ کے بعد ظہور میں آیا۔

(ب) عزیز کی بیوی نے اُن سب کے سامنے اُن کی بے گناہی اور اپنی طلب وسعی کا اعتراف کیا تھا، جیسا کہ آیت ۳۲ میں گزر چکا ہے۔ پس یہ سب اس بات کی گواہ تھیں کہ عزیز کی بیوی کے معاملہ میں اُن کا دامن بے داغ ہے۔

(ج) ان سب کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا تھا خود اُس سے بھی عزیز کی بیوی کا الزام بے اصل ثابت ہوتا تھا کیونکہ جس شخص کی پاکیٔ طبع کا یہ حال ہو کہ اُن تمام فتنہ گران شہر اور خوب رویان عہد کا متفقہ اظہار عشق بھی اُسے مسخر نہ کر سکا، کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ ایسا آدمی اپنے آقا کی بیوی پر ہاتھ ڈالے اور ایسی حالت میں ہاتھ ڈالے کہ وہ متنفر اور گریزاں ہو؟

اس معاملہ میں ایک اور دقیق نکتہ بھی ہے۔ اسی ۲۹ میں گزر چکا ہے

کہ جب عزیز پر اپنی بیوی کا قصور ثابت ہو گیا تو اُس نے کہا یوسف اعرض عن ھذا! (یوسف! اس بات سے درگزر کر) یعنی جو ہوا سو ہوا، اب اس کا چرچا نہ کیجیو کہ اس میں میری بدنامی ہے. بعد کو اگرچہ عزیز اپنی بات پر نہ رہا اور حضرت یوسف کو قید میں ڈال دیا۔ لیکن حضرت یوسف کا اخلاق ایسا نہ تھا کہ یہ بات بھول جاتے۔

عزیز نے انھیں غلام کی حیثیت سے خریدا تھا اور پھر اپنے عزیزوں کی طرح عزت و آرام کے ساتھ رکھا تھا. وہ اس کا یہ احسان نہیں بھول سکتے تھے۔ پس اُن کی طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ اس موقع پر اُس کی بیوی کا ذکر کرکے اس کی رسوائی کا باعث ہوں۔ صرف ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کا ذکر کر دیا کہ ان میں کوئی نہ کوئی ضرور نکل آئے گی، جو سچائی کے اظہار سے باز نہیں رہے گی۔

لیکن عزیز کی بیوی اب وہ عورت نہیں رہی تھی جو چند سال پہلے تھی. اب وہ ہوس کی خام کاریوں سے نکل کر عشق کی پختگی و کمال تک پہنچ چکی تھی. اب ممکن نہ تھا کہ اپنی رسوائی کے خیال سے اپنے محبوب کے سر پر الٹا الزام لگائے. جب عورتوں نے یوسف کی پاکی کا

اقرار کیا تو اس نے بھی خود بخود اعلان کر دیا۔ "سارا قصور میرا تھا۔ وہ بے جرم اور راست باز ہے"۔

جب تحقیقات کا نتیجہ آشکارا ہو گیا تو حضرت یوسف بادشاہ سے ملنے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیونکہ اب اُن کی رہائی بادشاہ کی بخشش نہ رہی اُن کا حق ہو گئی۔

اس معاملہ نے بادشاہ کا اشتیاق اور زیادہ کر دیا۔ اُس نے خیال کیا، جس شخص کی راست بازی، امانت داری اور وفائے عہد کا یہ حال ہے اُس سے بڑھ کر مملکت کے کاموں کے لئے کون موزوں ہو سکتا ہے۔

پس کہا۔ فوراً میرے پاس لاؤ۔ میں اُسے اپنے کاموں کے لئے خاص کروں گا۔ چنانچہ حضرت یوسف آئے اور بادشاہ پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ مسخر ہوا کہ بول اُٹھا۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے تم میری نگاہ میں بڑا مقام رکھتے ہو۔ مجھے بتلاؤ اس آنے والی مصیبت سے جس کی خبر خواب میں دی گئی ہے، مملکت کیوں کر بچائی جا سکتی ہے؟

حضرت یوسف نے کہا۔" اس طرح کہ ملک کی آمدنی کے تمام وسائل میرے ماتحت کر دیئے جائیں۔ میں علم بصیرت کے ساتھ ان کی حفاظت کر سکتا ہوں۔"

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ اور جب وہ دربار سے نکلے تو تمام مملکت مصر کے حکمران و خود مختار تھے۔

توراۃ میں ہے کہ فرعون نے یوسف کی باتیں سن کر درباریوں سے کہا:" ہم ایسا آدمی کہاں پا سکتے ہیں جیسا یہ ہے اور جس میں خدا کی روح بول رہی ہے! پھر یوسف سے کہا، دیکھ میں نے ساری سرزمین مصر پر تجھے حکومت بخشی۔ فقط ایک تخت نشینی ہی میں تجھ سے اوپر رہوں گا۔ اور اس نے اپنی انگوٹھی اتار کر یوسف کو پہنا دی اور گلے میں سونے کا طوق ڈالا، اور کتان کا لباس عطا کیا، اور اپنی رتھ سواری کو دی کہ شاہی رتھوں میں دوسری رتھ تھی، پھر جب وہ نکلا تو اس کے آگے آگے نقیب پکارتے تھے "سب ادب سے رہو"! اور فرعون نے حکم دیا یوسف کو صاحب مملکت کے لقب سے پکارا جائے۔

حضرت یوسف کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے

ایک وہ جب وہ غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے

معزز ہوئے کہ اس کے علاقہ کے مختار ہو گئے۔

دوسرا یہ کہ قید خانے سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ

حکمرانی کی مسندِ اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے۔ پس جب پہلے انقلاب

تک سرگزشت پہنچی تھی تو آیت ۲۱ میں حکمت الٰہی کی کرشمہ

سنجیوں پر توجہ دلائی تھی۔

کذلک مکنا لیوسف فی الارض

اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت ۵۶ میں فرمایا

کذلک مکنا لیوسف فی الارض

وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف کو

حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی، اس لئے فرمایا تھا:

ولنعلمہ من تاویل الاحادیث واللہ غالب علی امرہ

یہاں چونکہ تعمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا، اس لئے فرمایا:

لا نضیع اجر المحسنین!

یہ اس لئے ہوا کہ ہمارا قانون ہے کہ نیک عملی کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ پھل لائے۔

لیکن پھر غور کرو دنیا کی کون سی بات اس سے زیادہ عجیب ہو سکتی ہے کہ اسی قیدی کے لئے اچانک قید خانے کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور کھولنے والا کون ہوتا ہے؟ خود مصر کا بادشاہ۔ اور پھر کیوں کھولتا ہے؟ اس لئے کہ ایک عبرانی قیدی کو قید خانہ سے نکالے اور مصر کے تخت فرمانروائی پر بٹھا دے۔ گویا مصر کے قید خانے اور مصر کے تخت حکومت کا درمیانی فاصلہ ایک قدم سے زیادہ نہ تھا۔ اُس نے قید خانہ سے قدم اٹھایا اور اُس نے تخت فرمانروائی پر قدم رکھ دیا ؎

ملے ملیشود ایں رہ بہ درخشیدن برقے

مابے خبراں منتظر شمع و چراغیم!

پھر اس عجیب و غریب انقلاب کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایسا کہ ان ساری باتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے، اور جسے قرآن کی ایجاز بلاغت نے صرف ایک جملہ میں واضح کر دیا ہے۔

وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوّا منہا حیث یشاء

(اللہ نے سرزمین مصر میں اس کے قدم اس طرح جما دیئے کہ اُس کے جس حصّہ کو چاہے اپنے کام میں لائے)۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام خاندان کو کنعان سے مصر بلا لیا اور عین دار الحکومت میں کہ جشن کی سرزمین تھی عزّت و احترام کے ساتھ وہ بسائے گئے۔

اب وہی صحرا کے بدوی جو مصر میں قابل نفرت سمجھے جاتے تھے مصری دار الحکومت کے معزز باشندے ہو گئے، اور وہاں ان کی نسل میں اس درجہ برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی۔

کئی لاکھ انسانوں کی یہ قوم جو مصر سے نکلی کن لوگوں کی نسل سے بنی تھی؟ اسی لڑکے کی نسل سے جو غلام بن کر آیا تھا اور فرمانروا بن کر چمکا تھا۔ اور اس کے گیارہ بھائیوں کی نسل سے جنہوں نے اُسے ہلاک کرنا چاہا تھا ——— لیکن اُس نے اُنہیں زندگی اور زندگی کی کامرانیاں بخش دیں۔

اس طرح اس "عہد" کی کرشمہ سازیوں کا ظہور شروع ہو گیا جس

کی بشارتیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دی گئی تھیں اور پھر حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب سے بھی اُن کی تجدید ہوئی تھی ۔

رُوحانی صداقت اور مادّی ترقیات

کا مقابلہ

سب سے پہلی بات جو اس سلسلہ میں سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادّی ترقیات کا مقابلہ ہے۔ حضرت یعقوب کا گھرانا دین حق کی امانت رکھتا تھا۔ وحی الٰہی کی برکتوں سے فیض یاب تھا لیکن مادّی ترقیوں اور دنیوی شوکتوں میں سے کوئی بات بھی میسّر نہ تھی۔ حتّٰی کہ شہری زندگی کی ابتدائی خصوصیات سے بھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے تمام افراد صحرا میں رہتے تھے، مویشی چراتے تھے اور قدرتی زندگی کی سادگی پر قانع تھے۔

لیکن مصر کی حالت بالکل اس سے مختلف تھی۔ وہ دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان سے محروم تھا۔ لیکن وقت کی تمام

مادّی ترقیوں کا سرمایہ دار تھا۔ اس کے دارالحکومت کے لوگ لکھنے پڑھنے میں ماہر تھے۔ اس کے امراد و اشراف حکمرانی و دانشوری میں ترقی یافتہ تھے۔ اس کے مندروں کے کاہن حقائق اشیاء کا بھید جاننے والے تھے اور اس کے حکیم علوم و صنائع کے عجائب و غرائب سکھلانے والے تھے۔ آج عصریات مصر نے ایک مدّون علم کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کا فرعون غالباً وہ شخص تھا جسے آثار مصر میں "آبونی" کے نام سے پکارا گیا ہے اس کے عہد میں مصری تمدّن پوری طرح ترقی کر چکا تھا۔

لیکن جب عجیب و غریب اتفاقات نے اس صحرائی گھرانے کے ایک فرد کو مصر پہنچا دیا اور ایسی حالتوں میں پہنچایا جو کسی حال میں بھی عزّت و کامرانی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ یہ نکلا کہ دونوں قوتوں میں مقابلہ ہوا اور بالآخر دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔

حضرت یوسف کے پاس دین حق کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مصریوں

کے پاس دین حق کے سوا اور سب کچھ تھا۔ یہ صرف دین حق کی فضیلت سے آراستہ تھے۔ وہ ہر طرح کی مادی فضیلتوں میں تفوق رکھتے تھے بایں ہمہ ہر مقابلہ میں فتحمندی حضرت۔یوسف ہی کی سیرت و عمل کو ہوئی، اور ہر قدم قدم پر مادّی فضیلتوں کو اپنے تفوق سے دست بردار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ جب مملکت کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی، تو اس کی نجات کے لئے مادی فضائل کی کوئی پیداوار بھی کام نہ دے سکی۔ اسی عبرانی نوجوان کے آگے مصر کو جھکنا پڑا کہ اس کی سلامتی کی راہ نکال دے۔

جب حضرت یوسف نے پادشاہ مصر سے کہا تھا: اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم تو فی الحقیقت یہ دین حق اور فیضانِ وحی کا ایک اعلان تھا جو وقت کے سب سے بڑے مرکز تمدّن کے مقابلہ میں کیا گیا تھا۔ یعنی آج مملکت کی نجات کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم و کارروائی کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہو۔ لیکن ایسا پیش کرنے سے مصر کی پوری مدنیت عاجز ہو گئی۔ اس کا عظیم الشان دار الحکومت جو کارفرماؤں، دانشمندوں

اور کاہنوں سے بھرا ہوا تھا، ایک فرد بھی پیش نہ کر سکا جو یہ بوجھ اُٹھانے کا اہل ہو۔ لیکن میں تیار ہوں کہ یہ بوجھ اُٹھاؤں۔ میں دنیا کی سب سے بڑی مملکت کو اُس کی ہلاکت کی گھڑیوں میں بچاؤں گا۔ کیونکہ میں حفاظت کرنے والا، علم رکھنے والا ہوں۔

متمدن مصر نے کنعان کے صحرائی کا یہ اعلان سُنا اور اس کے آگے سر نیاز خم کر دیا۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے کہ وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منہا حیث یشاء نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین ولاجر الاخرۃ خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون!

قوانینِ عمل ونتائج عمل

لیکن یہ معاملہ کتنا ہی عجیب معلوم ہوتا ہو اور کیسی ہی عجیب حالتوں میں پیش آیا ہو، قرآن کہتا ہے کہ قوانین الٰہی کے قدرتی نتائج کا ظہور تھا اور حقیقت شناسوں کے لئے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک اسی طرح ہوا جس طرح آگ کے جلانے سے

گرمی نکلے یا پانی پینے سے پیاس بجھ جائے۔ کیونکہ اللہ نے اشیاء کی طرح اعمال کے خواص و نتائج ٹھہرا دیئے ہیں اور جب کبھی ایک خاص طرح کا عمل وجود میں آتا ہے تو ایک خاص طرح کا نتیجہ بھی ظہور میں آجاتا ہے یہاں ہر گوشے میں علت کے ساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے۔

بھائیوں نے جو کچھ یوسف کے ساتھ کیا وہ اس کے سوا کیا تھا کہ ایک خاص طرح کا انسانی عمل تھا اور جب خاص طرح کا عمل تھا تو خاص طرح کا نتیجہ نکلنا ہی تھا اور نتیجہ نکلا۔ حضرت یوسف زندگی کی مختلف آزمائشوں میں جو کچھ کرتے رہے، اس کی حقیقت بھی اس کے سوا کیا تھی کہ ایک خاص سیرت کے خاص اعمال تھے اور جب اعمال تھے تو ضروری تھا کہ جیسے کچھ اعمال ہوں ویسا ہی نتیجہ بھی نکلے۔ اور ویسا ہی نتیجہ بھی نکلتا رہا۔ اسی طرح سرگزشت کی تمام سیرتوں پر نظر ڈالو، ہر سیرت ایک خاص طرح کے عمل میں لگی ہوئی ہے اور ہر عمل ایک خاص طرح کا نتیجہ تیار کر رہا ہے۔ سب نے اپنے اپنے بیج بوئے تھے۔ اس لئے سب کو اپنے اپنے پھل ملنے تھے اور سب نے اپنے اپنے پھل پالئے، پس جہاں تک اعمال و نتائج کا تعلق ہے یہ تاریخ انسانیت کا کوئی مستثنیٰ

حادثہ نہ تھا بلکہ سنت الٰہی کی وہی کار فرمائی تھی جو ہمیشہ سے کارفرما ہے اور ہمیشہ کار فرما رہے گی۔

جب کبھی ایسے احوال و ظروف میں ایسے اعمال ظہور پذیر ہوں گے ضروری ہے کہ اسی طرح کے نتائج بھی ظہور میں آئیں۔ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

بلاشبہ حوادث کی نوعیت عجیب تھی، اور نتائج بھی عجیب طرح کے نکلے۔ لیکن سنتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کا تو ہمیشہ ایسا ہی حال رہتا ہے۔ وہ اپنی کس بات میں عجیب نہیں؟ وہ تو سرتاسر معجزہ ہے تم جب چاہو اپنے حسنِ عمل کی قوت سے ہر طرح کے کرشمے اور اچنبھے پیدا کر دے سکتے ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم چاہتے ہی نہیں۔ اور اسی لئے قانونِ عمل کے کرشمے تم پر کھلتے بھی نہیں۔

دنیا میں یوسفؑ کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ گزری، لیکن یوسف کے حسنِ عمل کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ کے لئے نہ تھی۔ بلاشبہ مصر کا بازار اب باقی نہیں رہا، لیکن دنیا کا بازار کس نے بند کیا ہے؟ آج بھی جس کا جی چاہے شانِ یوسفیت پیدا کر کے دیکھ لے۔ دُنیا کے تخت

عظمت و اجلال اُس کا استقبال کرتے ہیں یا نہیں؟

ہر کس نہ شناسندۂ رازست وگرنہ

ایں ہا ہمہ رازست کہ معلوم عوام است

یہی وجہ ہے کہ سورت میں جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارات کئے گئے کہ ارباب دانش کے لئے اس میں عبرتیں ہیں، موعظتیں ہیں، نشانیاں ہیں. سرگزشت کی ابتدا ہی اس اعلان سے ہوتی ہے کہ

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب!

پھر خاتمہ بھی اسی پر ہوتا ہے کہ:

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب!

نیز جا بجا اہم واقعات کے ظہور کے بعد وضاحت کردی ہے کہ:

کذٰلک نجزی المحسنین۔ انہ لا یفلح الظالمون (۲۳) انہ من یتق ویصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (۹۰)

یعنی یہ سب کچھ جو ظہور میں آیا عمل کا نتیجہ ہے، بدلہ ہے، مکافات ہے۔ اور جب نتیجہ ہے تو ضروری ہے کہ ہمیشہ ظہور میں آئے. جب بدلہ ہے تو ضروری ہے کہ ہمیشہ کام کرنے والوں کو ملے۔

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے جو بھائیوں نے پایا۔

راست بازی اور نیک عملی کا نتیجہ وہی ہے جو حضرت یوسف کو ملا۔

صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں رہ سکتا۔ جو حضرت یعقوب کے حصّہ میں آیا تھا۔

معصیت کے بیج سے

ہمیشہ وہی پھل پیدا ہوگا،

جو ———

امراۃ العزیز کو نصیب ہوا تھا۔

جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو۔

سچ نہیں ہو جا سکتا۔

سچ کتنے ہی ناموافق حالات میں اپنے کو پائے

لیکن جھوٹ نہیں ہو جا سکتا۔

علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمراں قوت ہے۔

سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔

حسنِ عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے۔

سب کو اس کا لوہا ماننے پڑے گا۔

⁂

حضرت یعقوب علیہ السّلام

سرگزشت کی اصلی عبرت اس کی خاص خاص شخصیتیں ہیں۔ اور ضروری ہے انہیں اچھی طرح پہچان لیا جائے۔

سب سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السّلام کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں دردِ و غم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر اور یقین کی رُوح بھی چھائی ہوئی ہے اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے درد و غم کے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔ لیکن صبر و یقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔ اس پر غالب نہیں آسکتے اور یہی صورتِ حال اس سیرتِ مقدس کا اسوۂ حُسنہ ہے۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک

دو لفظوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا کرتا ہے۔ پس غور کرو صورتِ حال کے یہ تینوں عنصر کس طرح اپنی انتہائی اور کامل صورتوں میں نمایاں ہوئے ہیں؟ درد و غم کی شدت جب نمایاں ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، آتش فراق کے شعلوں کا دھواں آنکھوں سے بے اختیار بہہ رہا ہے اور جسم کا ایک ایک ریشہ اس طرح گھل گیا ہے گویا سرتاپا جانگدازی و ہلاکت کی تصویر ہے:

وتولی عنھم، وقال یا اسفی علی یوسف! وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم اور یہ حالت ایک دن کی حالت نہ تھی بلکہ اس مدتِ فراق کی ہر صبح اور ہر شام اسی عالم میں بسر ہوئی تھی۔ قالو اتاللہ تفتؤا تذکر یوسف، حتی تکون حرضاً او تکون من الھالکین

یذکرنی طلوع الشمس صخرا ۔۔۔ واذکرہ بکل غروب شمس

لیکن پھر جب یقین کی روشنی چمکتی ہے تو اس کی نمود کا یہ حال ہے کہ دنیا کے سارے سہارے جواب دے چکے ہیں، امید کے سارے رشتے یک قلم ٹوٹ چکے ہیں، ہر طرف سے صدا اُٹھ رہی ہے کہ یوسف کی اب کوئی امید نہیں۔ لیکن ان کے دل کے ایک ایک ریشے کی صدا یہ ہے کہ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ واعلم من اللہ مالا تعلمون

(۸۶) اور ذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ ولا تایئسوا من روح اللہ !

(۸۷) حتی کہ ہر زبان جھٹلا رہی ہے اور ہر نگاہ دیوانہ سمجھ رہی ہے۔ لیکن ان کی زبان سے بے اختیار نکل رہا ہے :

انی لاجد ریح یوسف — مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے

تفاوت است میانِ شنیدن من و تو
تو بستن درو من فتح باب می شنوم

پھر دیکھو جب صبر کا مقام نمایاں ہوتا ہے تو اس کی مضبوطی کیسی غیر متزلزل، کیسی اٹل ہے؟ جب یوسف کے فراق کا داغ لگا تو اس وقت بھی زبان سے یہی نکلا کہ : بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون ! اور پھر جب بن یمین کی جدائی کی خبر سنی، تو اُس وقت بھی اس کے سوا کچھ زبان سے نہ نکلا کہ فصبر جمیل عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعا۔ انہ ھو العلیم الحکیم ! پھر باوجودیکہ بے خبر تھے۔ علم و یقین کے ساتھ سمجھ چکے تھے کہ یوسف کے ساتھ سازش کی گئی ہے، لیکن پوری سرگزشت میں کہیں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ دو باتوں سے زیادہ اس باب میں کچھ زبان سے نکلا ہو۔ ایک تو یہ کہ

بل سولت لکم انفسکم امراً اور دوسرا وہ جو اُس وقت زبان سے نکل گیا جب بھائیوں نے بن یمین کو ساتھ لے جانا چاہا: ھل امنکم علیہ الا کما امنتکم علیٰ اخیہ من قبل (۶۴) اور دونوں جملوں میں نہ تو ملامت کی سختی ہے نہ شکایت کی تیزی۔ بلکہ صورت حال کی ایسی تعبیر ہے جس سے زیادہ نرم اور دھیمی تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

پہلے جملہ میں صرف اس کا اظہار تھا کہ جو بات کہہ رہے ہو اصلیت اس کے خلاف ہے لیکن خیر، صبر کے سوا چارہ نہیں۔ دوسرے میں صرف پہلے واقعہ کا نتیجہ یاد دلایا ہے۔ کسی طرح کا الزام نہیں دیا ہے۔ یعنی مجھے بھروسہ کرنے کے لئے کہتے ہو۔ لیکن اگر بھروسہ کروں تو کیا اسی طرح کروں جس طرح پہلے کر چکا ہوں اور اس کا جو نتیجہ نکل چکا ہے تمہیں معلوم ہے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو پہلے جملہ کا اسلوب ایسا واقع ہوا ہے کہ سرزنش سے کہیں زیادہ رحم و تاسف پر مبنی ہے اور مخاطبوں کے لئے ایک طرح کی معذرت کا پہلو پیدا کر رہا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا تم نے یوسف کے خلاف سازش کی ہے۔ بلکہ کہا: تمہارے جی نے تمہارے لئے ایک بات بنا دی ہے اور اسے تمہارے

خیال میں خوشنما دکھا دیا ہے۔ کیونکہ "تسویل" کے معنی یہ ہیں کہ کسی بات کا جما دینا، خوشنما بنا کر دکھا دینا اور اس کے لئے طمع وخواہش کا پیدا ہو جانا۔ پس گویا یہ ایک ہمدرد دل کا تاسف تھا کہ افسوس، تم نفس کے دام میں پھنس گئے" اور اس کے دھوکے سے بچ نہ سکے۔ پھر ساتھ ہی ان کے اس طرز عمل کے لئے معذرت کے پہلو کا بھی اعتراف ہے کہ طمع نفس میں آکر ایسا کر بیٹھے ہو اور انسان نفس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے صدمۂ جانکاہ میں جیسا کہ حضرت یعقوب کو ناگہاں پہنچا تھا، اور کسی طرح کی بات کا زبان پر نہ آنا، صرف اسی جملہ کا نکلنا صبر کا کیسا عظیم الشان مظاہرہ ہے؟ یہ ممکن ہے کہ صدمہ کے فوری تاثر کے بعد ایک ضابط اور متحمل آدمی اپنے دل و زبان کی نگرانی کرلے لیکن عین اس وقت جب صدمہ کی پہلی چوٹ لگ رہی ہو اور دل کی بے تابیاں بے اختیار زبان کی طرف اُٹھنے لگی ہوں، ممکن نہیں کہ دل و زبان کی نگہداشت کی جا سکے۔ ضابط سے ضابط دل بھی اس عالم میں چیخ اُٹھتا ہے۔ مضبوط سے مضبوط طبیعتیں بھی بے اختیار متزلزل ہو

جاتی ہیں۔ لیکن حضرت یعقوب کا مقام صبر ایسا نہ تھا جو کسی حال میں بھی متزلزل ہو سکے۔ اس عالم میں بھی زبان کھلتی ہے تو ایسا سنبھلا ہوا جملہ نکلتا ہے، گویا بے حالی و جانکاہی کا کوئی معاملہ پیش ہی نہیں آیا ہے۔

یہی وہ صبر ہے جسے "صبر جمیل" فرمایا۔

بظاہر خیال ہوتا ہے کہ یہ تینوں باتیں بہ یک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر صبر کامل ہے تو پھر درد و غم کی شدتیں کیوں ہوں اور اگر یقین موجود تھا تو درد و غم کو محو ہو جانا چاہیے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس مقام میں مشکلات محسوس کیں اور طرح طرح کی توجیہوں کی جستجو میں نکلے۔ لیکن اگر وقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معاملہ بالکل واضح ہے اور کسی ایسی توجیہہ کی ضرورت نہیں جو بہ تکلف پیدا کی جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کا مقام صبر کا مقام تھا، اور صبر جبھی صبر ہو سکتا ہے جب بے صبری کے اسباب موجود ہوں اور زیادہ سے زیادہ موجود ہوں۔ اگر درد و غم کی ٹیس نہیں اُٹھ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جھیلنے اور اُف نہ کرنے کی حالت

موجود ہے؛ جھیلنا تو اسی کا جھیلنا ہوگا جو برابر آگ کی جلن محسوس کر رہا ہو، لیکن پھر بھی زبان سے اُف نہ نکالے۔

اگر حضرت یعقوب کا درد و غم اس طرح محو جاتا کہ اس کی جلن باقی ہی نہیں رہتی، یا رہتی تو بہت دبی دبائی رہتی۔ تو یہ مقام صبر کا مقام نہ ہوتا۔ موجبات غم سے متاثر نہ ہونے کا مقام ہوتا۔ اور ایسی حالت یا تو فرشتوں کی سی مخلوق کی ہوسکتی ہے، یا ایسے انسان کی جس کے احساسات معطل ہو چکے ہیں۔

لیکن حضرت یعقوب انسان تھے "فرشتہ" نہ تھے! اور اسی حیثیت سے قرآن نے ان کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ ان کی روح صبر و یقین سے معمور تھی۔ وہ یوسف کے خواب میں اس کا مستقبل دیکھ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ جدائی ختم ہونے والی ہے۔ تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ جس کی جدائی ایک گھڑی کے لئے شاق تھی، وہ برسوں کے لئے اُن سے جُدا ہو گیا تھا۔ یہ جانتے پر بھی کہ وہ زندہ و سلامت موجود ہے، اس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اس بات کے

تصور نے کہ وہ زندہ موجود ہے۔ مگر مجھ سے دُور ہے، دردِ فراق کی چبھن اور زیادہ کردی تھی۔

بلائے ہجر دارد انتظار پیر کنعانی
کسے داند کہ چوں یوسف عزیزی درسفردارد

فی الحقیقت اس صورت حال کی ساری عظمت اسی میں ہے کہ یہ ایک مادرار انسانیت سیرت نمودار نہیں کرتی۔ بلکہ ایسی حالتوں میں ایک کامل صابر و مومن کی زندگی کی جو تصویر ہو سکتی ہے، وہ سامنے آگئی ہے، دل آتش فراق میں پھنکا جارہا ہے اور ہزار کوشش کی جائے لیکن یہ آگ اس طرح بجھنے والی نہیں۔ لیکن ساتھ ہی روح ایمان ویقین سے معمور ہے اور دماغ صبر جمیل کا عزم کر چکا ہے۔ پس غم کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ ہے۔ اگر دل اپنی بے قراریوں میں کبھی کمی نہیں کرتا تو دماغ بھی اپنے شیوۂ صبر و رضا میں کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی بے تابیاں حد سے گزر جاتی ہیں اور "یا اسفیٰ علیٰ یوسف" بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔

لیکن یہ بھی نکلتا ہے تو کس کے آگے نکلتا ہے؟ اُس کے آگے، جس کے

آگے اپنا دردِ و غم پیش نہ کیجئے تو یہ بھی شانِ عبودیت کے خلاف ہے۔

انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ، واعلم من اللہ ما لا تعلمون۔

مکن تغافل ازیں بیشتر کہ مے ترسم

گمان برند کہ ایں بندہ بے خداوندست

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یعقوب کے بعد حضرت یوسف (علیہم السلام) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، اور یہی سرگزشت کی اصلی شخصیت ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ایک خاص حقیقت کی جلوہ نمائی شروع ہو جاتی ہے، اور جس جس رُخ سے دیکھیے اور جہاں کہیں دیکھیے اس کی نمود سامنے آتی رہتی ہے۔ یعنی انسان کی سیرت (کیریکٹر) کی فضیلت اور اس فضیلت کی اٹل کامرانیاں۔

ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوّت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اور اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لئے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دُنیا کی

ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں، جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دُنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں جب بھی اُس کی رفتار نہیں رُکے گی۔ حوادث و وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد و جماعت کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لئے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اُس کے لئے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اس کے لئے ہر طاقت پر فرمانروائی ہے۔ وہ اعمال و نتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اسی لئے ہے کہ سر بلند ہو۔ عجز و درماندگی کی آلودگی کبھی اُسے چھُو نہیں سکتی۔

سترہ برس کا ایک کمسن لڑکا، باپ کی آغوشِ محبت سے جبراً چھین لیا جاتا ہے، اور اچانک اپنے آپ کو کن لوگوں میں پاتا ہے؟ ان لوگوں میں جو چند سکوں کے بدلے اسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں دنیا کی ایک لاکھ انسانی طبیعتیں ایسی حالت میں کیا کرتیں؟ مگر غور کرو، اُس نے کیا کیا؟

اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح

اُس نے صورتِ حال کا پورا جائزہ لے لیا ہو اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آجائے اُسے صبر و سکون کے ساتھ جھیل لینا چاہیے اور اسی کے مطابق کام کئے جانا چاہیے۔ قافلہ والوں نے انہیں غلام کی حیثیت میں پیش کیا، وہ ایک غلام کی طرح پیش ہو گئے۔ عزیزِ مصر نے غلام کی طرح خرید کیا، انہوں نے غلام کی طرح اُس کی خدمت شروع کر دی، اور اس کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جس طرح ایک طاعت شعار اور وفادار غلام کو اپنے آقا کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ کہیں سے بھی کوئی ایسی بات مترشح نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے میں انہیں کوئی تامّل ہوا ہو۔ گویا یہ ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لئے پوری زندگی کی سوگواری بن جاتی، ان کے لئے کوئی مصیبت ہی نہ تھی۔

باپ کی آغوشِ محبت سے نکل کر اچانک ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کا غلام بن جانا، اُن کے لئے ایسی ہی بات ہوئی، جیسے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک عیش چھوڑ کر دوسرا عیش اختیار کر لینا۔ نہ پچھلی حالت کا ماتم ہے، نہ موجودہ حالت سے جھجک۔ نہ گزشتہ کی یاد

یاد میں سوگواری ہوئی، نہ آئندہ کے اندیشہ میں بدحالی۔ اُس عازم اور بے پروا ملاح کی طرح جسے نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہے نہ آنے والے طوفان کا اندیشہ، اس نے اپنی کشتی چلانی شروع کردی اور دیکھو بالآخر ساحل مقصود تک پہنچ کر رہی۔

حوادث وانقلاب کے ترکش میں اس سے بڑھ کر اور کون تیر ہو سکتا ہے جو اس پر چلایا گیا تھا؟ لیکن اس کے صبر وعزم نے اُسے پر کاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اس طرح بے داغ نکل گیا گویا گردش حوادث کا ہاتھ اس کے خلاف اُٹھا ہی نہ تھا۔

چیں بر جبیں ز جنبش ہر خس نمی رسد

دریا دلاں چو موج گر آرمیدہ اند!

غور کرو۔ ہر انسان کے لئے جو دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں اپنی راہ نکالنا چاہتا ہو، اس معاملہ میں کیسی عظیم الشان عبرت ہے؟ اگر حضرت یوسف نے مصائب ومحن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس اور توکل علی اللہ کی یہ روحِ عظیم اپنے اندر نہ پیدا کرلی ہوتی، تو کیا ممکن تھا کہ اس منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخر اُن کی منزل

مقصود ثابت ہوئی۔

پھر دیکھو زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائش پیدا کرتی رہیں اور اُن کی غیر متزلزل اور بے داغ سیرت کس طرح فتحمندیوں پر فتحمندیاں حاصل کرتی گئی؟

سب سے پہلے عزیز مصر کے ساتھ ان کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ اُس نے بحیثیت غلام کے انہیں خرید کیا تھا۔ اور مصر کے آثار و نقوش ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوا کرتا تھا۔ وہ غلاموں کے لئے اتنے ہی سنگ دل تھے، جتنی سنگدل دُنیا کی تمام پُرانی قومیں رہ چکی ہیں۔ تاہم انھوں نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر اپنے حسنِ سیرت سے اُس کا دل ایسا مسخر کر لیا کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگے۔ اور اس نے اپنی بیوی سے کہا: اکرمی مثواہ عسٰی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا۔

غور کرو۔ یہ انقلاب حال کیسے پیدا ہوا ہو گا؟ وہ کیسی وفاداری، و دیانت اور راست بازی و امانت شعاری ہوگی، جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ ایک عبرانی غلام کو

اپنے فرزند کی طرح چاہنے لگا، اور اپنے تمام گھر بار اور علاقہ کا مختار کُل بنا دیا؟

پھر امراۃ العزیز کا معاملہ رُو نما ہوتا ہے۔ پچھلی آزمائش ذہن و دماغ کی آزمائش تھی۔ یہ جذبات کی تھی اور انسان کے لئے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا، پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا، درندوں کے مقابلہ سے منہ نہیں موڑتا۔ تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن حضرت یوسف کی سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہیں ہو سکی، ان کی بے داغ فضیلت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر صورتِ حال کی پوری تصویر کھینچ دی ہے اور اگر اُن اشاروں کو تشریح و بیان کا پورا جامہ پہنایا جائے تو کئی صفحوں کی داستان بن جائے۔

تم چشمِ تصور سے کام لو اور دیکھو، ترغیبات کی قہرِ سلطانی کا کیا حال تھا اور عیشِ نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر رُبا حالتوں کے ساتھ پیش آئی؟ عمر، عینِ عروجِ شباب کی عمر، اور معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت کا، طلب کا نہیں، مطلوبیت کا ــــ پھر طلب بھی ہوئی تو کیسی طلب؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ موانع یہ کلّی مرتفع ہو گئے۔ کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردۂ حجاب حائل ہونے والا نہیں۔ کون ہے جو ایسی حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟ عفّت و پاکی کا کون سا پہاڑ ہے جو ان بجلیوں کی تاب لا سکتا ہے؟ ــــ

لیکن ایک پہاڑ تھا جسے یہ بجلیاں کبھی جنبش میں نہ لا سکیں۔ یہ حضرت یوسف کی سیرت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہو سکتی تھی۔ خود امرأۃ العزیز کے لفظوں میں (اور اس سے بڑھ کر اس معاملہ کا کون شاہد ہو سکتا ہے) انا راودته عن نفسه فاستعصم۔ وہ اس حال میں بھی اپنی جگہ سے بے جگہ نہ ہوا۔

اس کوہ عصمت کے لئے ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔

پھر دیکھو! امرأۃ العزیز کی دعوتِ عیش کے جواب میں جو کچھ اُن کی زبان سے نکلا وہ کیا تھا؟ معاذ اللّٰہ انہ ربی احسن مثوی۔ تیرا شوہر میرا آقا ہے۔ اُس نے مجھ پر اعتماد کیا۔ عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس کے حسن و سلوک کا بدلہ میں یہ دوں کہ اس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں؟ غور کرو یہ برائی ایسی بُرائی تھی کہ اُسے برائی دکھلانے کے لئے کتنی ہی باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ لیکن ان کا ذہن اسی بات کی طرف گیا اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کر کے دکھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اُن کی سیرت کا اصلی جوہر ہمیں ڈھونڈنا چاہیئے امانت داری، راست بازی اور ادائے فرض کی روح اس طرح ان پر چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر سب سے پہلے وہی سامنے آتی تھی۔

پھر اس کے بعد لائمات کا معاملہ پیش آتا ہے۔ اب صرف ایک امرأۃ العزیز ہی کا فتنہ نہ تھا۔ دارالحکومت مصر کے تمام فتنہ گرانِ حُسن جمع ہو گئے تھے کہ اُن کی متاعِ ضبط و تحمّل کی غارت گری

میں حصہ لیں۔

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا ___؟ قلن حاش اللہ ! ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم (۳۱)

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

پھر دیکھو! راست بازی و حق پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کر لی؟ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لئے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے۔ لیکن اب حضرت یوسف کے سامنے قید کی سزا اس لئے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں! لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لئے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈتے ہیں، اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف کو اس لئے قید خانے کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ عیش حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی اور انہوں نے اُس سے

مُنہ موڑ لیا۔

یہ حضرت یوسف کی سیرت کا سب سے زیادہ عظیم مظاہرہ ہے یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں: زندگی کا عیش مگر معصیت حق کی راہ میں۔ زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں۔ تو ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا کہ السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ (۳۳) قیدخانہ مجھے محبوب ہے مگر وہ بات نہیں جس کی مجھے دعوت دی جا رہی ہے۔

ہمارے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت یوسف کی بدشگونی تھی کہ خود قیدخانہ کی بات بول اُٹھے۔ اگر جلدی میں آکر ایسا نہ کہہ دیتے تو یہ ابتلا پیش نہ آتی۔

افسوس، کس درجہ حقیقت فراموشی ہے۔ حضرت یوسف کی جو بات ان کی پاکی و عظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی وہی ان حقیقت ناآشناؤں کی نظر میں ان کی لغزش ہو گئی۔ گویا حضرت یوسف کا قیدخانہ کو معصیت پر ترجیح دینا اور اسے خوشی خوشی اختیار کر لینا کوئی ایسی

بات تھی جو نہ ہونی چاہیئے تھی اور صرف اس لئے ہو گئی کہ حضرت یوسف نے بدشگونی کی بات کہہ دی تھی۔ غور کرو قرآن کہاں ہے اور اس کے شارح کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

پھر دیکھو، حضرت یوسف کی یہی سیرت ہے جو قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی کو بھی اسی طرح روشن کر دیتی ہے، جس طرح عزیز مصر کے ایوان، عزت و اقبال کو اس نے روشن کر دیا تھا۔ کیونکہ چراغ جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے روشنی ہی دے گا اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہیں ہو جائے گی کہ جواہر خانۂ شاہی میں رہنے کی جگہ کوڑے کرکٹ میں ڈال دیا گیا۔ تورات کی تصریح پڑھ چکے ہو کہ قید خانہ کا افسر ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ اور قید خانہ میں ان ہی کی افسری قائم ہو گئی تھی۔

پھر دیکھو۔ عین قید خانہ کی زندگی میں دعوت حق کا داعیہ ان کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت تک مصر میں انہوں نے دین حق کی تبلیغ نہیں کی تھی۔ اگرچہ خود اسی پر قائم تھے۔ لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ خاندانی نبوت کا ان میں ظہور ہو۔ چنانچہ اسی کا

نتیجہ ہے کہ اب یکایک اپنے قلب کو ولولۂ تبلیغ سے معمور پایا، لیکن کون تھا جو اس تبلیغ کا مخاطب ہوتا؟ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے جو طرح طرح کے جُرموں کی پاداش میں یہاں پہنچا دیئے گئے تھے۔ مگر غور کرو، انھوں نے رہائی کا انتظار نہیں کیا۔ انہی قیدیوں میں تبلیغ حق شروع کردی اور اب مصر کا قید خانہ دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درس گاہ بن گیا۔

پھر دیکھو! تبلیغ حق کے جوش و طلب کا کیا حال ہے؟ دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے تھے اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سُن کر حضرت یوسف معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے، دوسرے کی موت قریب ہے۔ پس چاہتے ہیں کہ فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں اور تعلیم حق سے انھیں آشنا کر دیں۔ ممکن ہے جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے۔ جس کی موت قریب ہے، ممکن ہے سچائی قبول کرلے اور دنیا سے جائے تو راہ حق پر جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، انھوں نے خواب سنتے ہی

اس کی تعبیر نہیں تبلا دی، بلکہ اُن کی توجہ و رجوع سے فائدہ اُٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کر دیا۔

انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ وھم بالآخرۃ هم کٰفرون (۳۷)

ان کی سیرت کے اس مقام سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ دعوتِ حق کا فریضہ کیونکر ادا کرنا چاہیئے اور داعی حق کے جوش و طلب دعوت کا کیا حال ہونا ہے؟ قید خانے کی زندگی بھی ادائے فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ میں کیونکر قید سے رہائی پاؤں بلکہ تمام تر اس کی تھی کہ خدا کے بندے جہل و گمراہی سے کیونکر نجات پائیں؟ مہلت جب کبھی ملی اور جس حال میں ملی، معاً اسی مقصد کے لئے کام میں لائی گئی اور جس طرح اُس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا اسی طرح اس کی ہدایت کے لئے بھی صبر نہ کر سکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا فطری حق ہے، اور زندہ رہنے والا ہو یا مر رہا ہو، اُسے اُس کا حق فوراً

ملنا چاہیئے۔

پھر دیکھو! معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں۔ جوں ہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی پادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر مامور ہونے والا ہے۔ معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت و جلوت میں پادشاہ کے حضور میں رہنے والا ہے، کتنا اچھا موقع حاصل ہوگا کہ پیام حق پادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے۔ چنانچہ تعبیر بیان کرنے کے بعد اُس سے فرمایا:

اذکرنی عند ربک — اپنے آقا کے پاس جا ئیو تو مجھے یاد رکھیو

یعنی میری یہ تعلیم و دعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بہ عنوانِ مناسب اس کا تذکرہ کر دیجیو ——— ممکن ہے کہ پیام حق کام کر جائے۔

عام طور پر حضرت یوسف کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی رہائی کے لئے کہا تھا۔ یعنی اپنے آقا سے

میری سفارش کیجیو۔

لیکن جس محل میں یہ بات کہی گئی ہے اُس سے اُس کی تائید نہیں ہوتی۔ قیدیوں سے جو کچھ بھی اُن کی گفتگو ہوئی ہے، یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں ہے۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے اپنے قید محن کے مصائب کا کوئی ذکر کیا ہو پس اس بات کا وہی مطلب موزوں معلوم ہوتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ قیدیوں کا خواب سن کر آپ نے تعبیر فوراً بیان کیوں نہیں کر دی تھی' مفسرین کہتے ہیں' تاخیر اس لئے کہ وحی کا انتظار تھا۔ لیکن اگر آپ انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیوں کر وعدہ کر لیتے کہ:

لا یاتیکما طعام ترزقنہ الا نبأتکما بتاویلہ

اور فیضان وحی سے تو آپ کا قلب معمور ہو رہا تھا، تعبیر کے لئے انتظار کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی —— ؟ صاف بات یہی ہے کہ تاخیر قصداً کی تھی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج

نے دونوں کو میری طرف متوجہ کردیا ہے، چاہیئے کہ اس توجہ سے فوراً فائدہ اُٹھایا جائے اور دین حق کی دعوت چھیڑ دی جائے، چنانچہ اس کا ذکر اس مناسبت سے شروع کردیا کہ

ذالکما مما علمنی ربّی۔ انی ترکت ملة قوم لا

یومنون باللہ وھم بالاٰخرة ھم کافرون (۳۷)

یعنی خواب کی تعبیر میں بہت جلد بتادوں گا۔ کیونکہ میرے پروردگار نے مجھے اس کا علم دیا ہے۔ لیکن میرے علم کو اس طرح کا علم نہ سمجھنا جس طرح اپنے کاہنوں اور جادوگروں کا سمجھا کرتے ہو۔ میری راہ دوسری ہے۔ میں تمہارے طریقہ پر کاربند نہیں۔ پھر اس طرح بات میں سے بات نکالتے ہوئے دین حق کی دعوت شروع کردی کہ:

یا صاحبی السجن !	اے یاران مجلس !
ءارباب متفرقون خیرٌ ام	جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے
اللہ الواحد القہار ؟	یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے ؟

پھر دیکھو اس سیرت کی فضیلت کا کیا عجیب منظر سامنے آجاتا ہے جب پادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے اور سردار ساقی آکر یہ معاملہ انھیں سناتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان ایسے موقعے پر کیا کرتا؟ دنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا جسے بغیر کسی جرم وگناہ کے قیدخانہ میں ڈال دیا گیا ہو اور سالہاسال سے اس حالت میں بے یار ومددگار پڑا ہو؟ یقیناً اسے تائید غیبی سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا اور کہتا۔ میں یہ مشکل حل کر دے سکتا ہوں۔ مجھے یہاں سے نکلنے اور پادشاہ کے حضور حاضر ہونے کا موقع دیا جائے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں حضرت یوسف کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش ظاہر نہیں ہوتی۔ انھوں نے خواب سنتے ہی اس کی تعبیر بیان کر دی۔ اس کا خیال بھی انہیں نہیں گزرا کہ اپنی مطلب براری کی یہ نہایت قیمتی بات تھوڑی دیر کے لئے روک لوں۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ جتنی بات پوچھی گئی تھی، بتلادی، بلکہ اس سے بھی زیادہ علم وفضل کی بخشش سائل کے دامن میں ڈال دی یعنی خواب میں ایک آنے والی ہولناکی کی خبر دی گئی تھی۔ انہوں نے

تعبیر کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اس ہولناک مصیبت سے بچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ سوال بادشاہ کی طرف سے تھا۔ لیکن دیکھو، جس نے جواب دیا وہ قیدخانہ کی کوٹھڑیوں میں بیٹھا ہوا اپنے علم و فضیلت کی بخشش میں بادشاہوں سے بھی زیادہ فیاض تھا۔

عدیلِ ہمت ساقی است فطرت عرفی

کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

حضرت یوسف نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ دنیا نے اُن کے ساتھ کچھ ہی کیا ہو، وہ دنیا کی خدمت و ہدایت کے سوا اور کوئی شے اپنے سامنے نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب انھوں نے خواب سُنا اور خواب کا حل ان کے علم و بصیرت نے معلوم کر لیا تھا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی علم و ہدایت کا فیضان انسانوں پر نہیں روک سکتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ جب کبھی طلب و اعانت کا ہاتھ ان کے آگے بڑھے، وہ اُس کی دستگیری کریں اور انہوں نے دستگیری کی۔ اگر نہ کرتے تو داعی حق نہ ہوتے۔ اُن کا بے لوث جذبۂ خدمت اس خود غرضانہ مطلب براری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ ایک انسان کی مشکل اور احتیاج

کو اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔

پھر جب بادشاہ ملاقات کا مشتاق ہوا اور اپنا پیامبر بھیجا تو چاہیئے تھا کہ جوش مسرت سے اس پیام کا استقبال کرتے. کیونکہ اب خود بخود رہائی سامنے آ گئی تھی۔ اور ایسی حالت میں آئی تھی. کہ بادشاہ وقت مشتاق زیارت ہو رہا تھا. لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف کی نگاہوں میں معاملہ نے دوسری ہی شکل اختیار کی۔ انہوں نے قید خانہ چھوڑنے اور بادشاہ کی ملاقات سے انکار کر دیا۔ اور کہلایا کہ پہلے میرے معاملہ کی تحقیقات کر لی جائے۔

اب یہاں پھر بے اختیار یہی سوال سامنے آ جاتا ہے کہ دنیا کا ہر مظلوم قیدی ایسی حالت میں کیا کرتا اور پیکرِ صدق و صفا نے کیا کیا ـــــ؟

غور کرو، ان کی سیرت کیسے جوہروں سے گوندھی گئی تھی اور کس طرح صبر و ضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خودداری اور عزّت نفس کی روح اس کے ایک ایک ذرّہ میں رچی ہوئی تھی؟ حضرت یوسف کے اس انکار و انتظار میں اُن کی اخلاقی ذہنیت کی ایک

پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ قید سے رہائی بلاشبہہ ایک خوشخبری ہے۔ لیکن ایسی رہائی مجھے کیا خوش کرسکتی ہے جو میری بے جرمی کی وجہ سے ظہور میں نہ آرہی ہو۔ بلکہ محض پادشاہ کا ایک عطیہ اور بخشش ہو؟ میں تو تھا مجرم، لیکن چونکہ بادشاہ نے خواب دیکھا، کسی سے تعبیر بن نہ آئی، میں نے تبلادی، اس لئے خوش ہوکر بادشاہ نے رہا کردیا۔

پس یہ بادشاہ کا احسان ہوا۔ حق وانصاف کا فیصلہ نہ ہوا نہیں میں اپنی رہائی بطور ایک احسان کے قبول نہیں کرسکتا۔ اگر میں مجرم ہوں تو سزا کا سزاوار ہوں۔ کیوں مجھے کوئی بخشے؟ اگر مجرم نہیں ہوں تو میری بے جرمی کا اعتراف کرنا چاہیئے، اور اس لئے کرنا چاہیئے کہ سزا کا مستحق نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ کسی نے بخش دیا۔

عزّت نفس اور استقامت حق کا کیسا بلند مقام ہے! اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے جس میں کہیں سے بھی کوئی لچک پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو، اُس

کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں اور اس سورج کی روشنی کبھی مدّھم نہیں پڑ سکتی۔

كانه علمٌ فی راسه نار !

فی الحقیقت جمال یوسف کی یہی رعنائیاں تھیں جنہوں نے ایک ہی نظارے میں پادشاہ کا دل مسخّر کر لیا تھا۔

انك اليوم لدينا مكين امين (۵۴)

پھر سب سے آخر اس موقع کا مطالعہ کرو جب حضرت یوسف کے بھائی ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں ـــ کون بھائی ـــ؟ جنہوں نے قتل کا سامان کیا اور پھر غلام بنا کر اجنبیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ کس کے سامنے ـــ؟ اس مظلوم کے سامنے جو آج مظلوم نہیں ہے، بلکہ وقت کی سب سے بڑی مملکت کا مالک اور قحط سالی کی سب سے بڑی مصیبت میں سامان زندگی بخشنے والا ہے۔ کیسا عجیب موقع تھا اور نفس انسانی کے لئے ولولۂ انتقام کی کیسی صبر آزما آزمائش!

تاہم غور کرو، اوّل سے لے کر آخر تک حضرت یوسف کا طرزِ عمل

کیسا رہتا ہے؟ کہیں بھی کوئی بات ایسی دکھائی دیتی ہے کہ کہہ سکو، بغض و انتقام کے جذبہ کی کوئی ہلکی سی بھی پرچھائیں پڑ رہی ہے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو اُن کے لئے سرتاپا شفقت و رحمت ہو گئے تھے۔ انتقام و سرزنش کا کیا ذکر ہے۔ ان کی زبان سے تو ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے بھائیوں کے دلوں کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی صاف نظر آرہا ہے کہ ان کی شرمندگی و پشیمانی کا زخم ان سے کہیں زیادہ خود اُن کے دل پر لگ رہا ہے، اور اب فکر ہے تو اس بات کی کہ کس طرح ان کے دلوں کے تسکین خاطر کے سامان پیدا کردیں۔

جب تیری مرتبہ بھائی اور اپنی مصیبتوں کی داستان سنائی، مسنا و اھلنا الضر اور پھر دست سوال بڑھایا کہ تصدق علینا۔ ان اللہ یجزی المتصدقین (۸۸) تو جوش محبت سے بے قرار ہو گئے۔ اس وقت اُن کے سامنے اور کوئی بات نہ تھی۔ صرف یہ تھی کہ میرے بھائی فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ میں مسندِ عزت پر بیٹھا ہوں اور وہ دریوزہ گروں کی طرح دست

سوال دراز کئے ہوئے ہیں۔ بے اختیار اُن کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو ظاہر کر دیں۔

هَل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیه ؟ — تمہیں وہ بات بھی یاد ہے جو یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کی تھی ؟

کہنے کو تو یہ کہہ گئے اور یہ کہے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ یاد دلانا تھا کہ میں مصر کو کیونکر پہنچا۔ لیکن معاً یہ خیال ہوا کہ اس معاملہ کی یاد میں ان کے لئے سرتاسر سرزنش و خجالت ہے۔ اس لئے فوراً ایک ایسی بات بھی کہہ دی کہ ان کے لئے ایک معذرت کا پہلو نکل آئے اور شرمندگی کا بوجھ محسوس نہ کریں۔

اذ انتم جاهلون (۸۹)

یہ اس وقت کی بات ہے جب تمہاری نادانیوں کا زمانہ تھا۔ یعنی اس معاملہ پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ نادانیوں کے زمانہ کی ایک بات ہے اور دنیا میں کون ہے جس پر کوئی نہ کوئی زمانہ نادانیوں کا نہ گزرا ہو ؟

یہ سنتے ہی جب انھوں نے پہچان لیا اور عجز و ندامت کا سر

جھکا کر بولے:

تاللہ لقد اثرک اللہ علینا، وان کنا لخاطئین (۹۱)

تو بلاتامّل جواب ملا۔

لاتثریب علیکم الیوم۔ یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین!

نہیں آج کا دن بچھڑے ہوؤں کو ملنے اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جُڑنے کا دن ہے۔ ملامت والزام کی باتوں کا یہاں گُزر نہیں، میرا دل تو ہر طرح کی رنجشوں سے صاف ہے۔ باقی رہا خُدا کا معاملہ، تو اس کے لئے بھی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ تمہارے سارے قصور بخش دے۔ اور وہ ضرور بخش دے گا کیونکہ اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور کون ہے؟

پھر جب آگے چل کر جب وقت آیا کہ اللہ کے فضل وکرم کا شکر ادا کرتے ہوئے گزُرے ہوئے واقعات کی طرف اشارہ کریں تو دیکھو اس معاملہ کی طرف کیونکر اشارہ کرتے ہیں۔

من بعد ان نزغ الشیطان بینی وبین اخوتی (۱۰۰)

(جب ایسا ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا)

یعنی اوّل تو اس معاملہ کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا، کہ بھائیوں پر اس کا بوجھ پڑے۔ گویا یہ شیطان کا ایک فتنہ تھا، ورنہ میرے بھائی ایسا کیوں کرتے۔ پھر سارے معاملہ کو محض ایک طرح کے اختلاف سے تعبیر کیا تاکہ اصل واقعہ کی شناخت کم ہو جائے۔ پھر جتنا کچھ بھی ہونا ظاہر کیا، وہ اس طریقہ پر کیا کہ "— مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف پڑ گیا تھا —" گویا یہ بھائیوں کا بلا وجہ جور وستم نہ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جیسے بھائیوں میں باہم دگر پیش آجایا کرتی ہے اور دونوں جانبوں کو اختلاف کے وجوہ میں دخل ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک ہی جانب کا قصور تھا۔

غور کرو، عفو و بخشش کا وہ کیسا مقام ہے، ہمت کا وہ کیسا علو ہے۔ ظرف کی وہ کیسی پہنائی ہے، خُلق کی وہ کیسی عظمت ہے جو دشمنی کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتی ہے؛ اور جس سیرت کا یہ

حال ہو اس کے لئے فضیلت کی اور کون سی بات باقی رہ گئی ؟

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلاف است جنگ

مظلومی و بیچارگی کی حالت میں صبر کر لینا بلاشبہ ایک بڑائی ہے لیکن طاقت و اختیار کی حالت میں بدلہ نہ لینا اور بخش دینا سب سے بڑی بڑائی ہے : ولمن صبر و غفر ان ذلک لمن عزم الامور اور اس سیرت کی عظمت میں دونوں مقام جمع ہو گئے۔ جب بیچارگی تھی تو اُف تک نہ کی۔ جب طاقت ملی تو انتقام کا وہم و گمان بھی نہ گزرا اور بلاشبہ یہ اس زندگی کا سب سے بڑا اسوۂ حسنہ ہے۔

سب سے آخر میں اُن کی دعا نمایاں ہوتی ہے اور یہ فی الحقیقت ایک مرقع ہے جس میں ان کی سیرت کا ایک ایک خط دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ عظمت و کامرانی کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی جو صدا ان کے دل و دماغ سے نکل سکتی تھی وہ یہ تھی کہ فاطر السموات

والارض: انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین (۱۰۱) یعنی زندگی کی ساری کامرانیوں کا آخری ماحصل جس کی طلب و آرزو سے کبھی دل خالی نہیں ہو سکتا، یہی ہے کہ اطاعتِ حق پر خاتمہ ہو۔ اور الحاق اُن کے ساتھ ہو جو تیرے صالح بندے ہیں۔

امرأة العزيز

حضرت یوسف کے بعد سرگزشت کی نمایاں شخصیت امرأۃ العزیز کی شخصیت ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف کی مصری زندگی کے حوادث میں بڑا حصہ اسی کا ہے۔ اس شخصیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ عشق و ہوس کے مختلف مراتب یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے ہیں اور قرآن حکیم نے ایک عجیب اسلوب بلاغت کے ساتھ انہیں ہر جگہ اُبھارا ہے اور ہر مرتبہ کی خصوصیت واضح کر دی ہے

سب سے پہلے وہ موقع سامنے آتا ہے جب اس نے حضرت یوسف کو دعوت عیش دی اور ناکام رہی ولقد همت به وهم بها لولا ان را برهان ربه۔

اور جب پردہ فاش ہو گیا اور شوہر سامنے کھڑا نظر آیا تو اپنی ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی۔ جھوٹ اپنا جرم دوسرے کے سر ڈال دیا اور پھر کس دوسرے کے سر؟ اسی کے سر جس کی محبت و شیفتگی کی مدعی بنی تھی۔ قالت ما جزاء من اراد باهلك سوءًا الا ان يسجن او عذاب اليم (۲۵) اس سے معلوم ہوا کہ محبت میں ابھی

کچی تھی اور ہوس سے معاملہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ کیونکہ اگر محبت کامل ہوتی تو
محبت کی راہ میں ذلت و رسوائی سے نہ ڈرتی اور خود اپنے محبوب کے سر جھوٹا الزام نہ
لگاتی۔ لیکن پھر جب کچھ دن گزر گئے تو معلوم ہوتا ہے اس حالت نے دوسرا
رنگ اختیار کیا۔ اب اُسے لائمات کے سامنے تو اقرار محبت میں عار نہ آیا لیکن
دنیا کے سامنے اقرار نہ کر سکی: انا راودتہ عن نفسہ فاستعصم
(۳۲) ساتھ ہی محبت ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی کہ اپنے نفس کی
کامجوئیوں پر محبوب کی مرضی کو ترجیح دیتی۔

قبول خاطرِ معشوق شرط دیدار است
بہ حکم شوقِ تماشا مکن کہ بے ادبی است

اس لئے دھمکیاں دے کر رام کرنا چاہا: ولئن لم یفعل ما امرہ لیسجنن
ولیکونا من الصاغرین (۳۲) لیکن پھر جب وہ وقت آیا کہ عشق کی خامیاں
پختگی و کمال تک پہنچ گئیں تو اب نہ تو ننگ و ناموس کی جھجک باقی رہی تھی
نہ زور و طاقت سے کام نکالنے کا گھمنڈ۔
جونہی سنا کہ یوسف کے معاملہ کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے، بے
پردہ اور صریح اعلان کر دیا: الئن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ

دانہ لمن الصادقین (۵۱) وہ تو سرتاسر سچا ہے، جو کچھ بھی قصور تھا میرا تھا۔

ہاں، بانگ بلند ست ہیں پوشیدہ نمی گویم!

اب اقرار محبت میں نہ تو کسی طرح کا عار محسوس ہوتا تھا نہ عشق کی ذلّت و رسوائی رہی تھی۔ اب تو ہر بات جو محبوب کی راہ میں پیش آئے محبوب ہی کی طرح محبوب ہو گئی تھی۔

اجد الملامۃ فی ہواک لذیذۃ   حبًّا لذکرک فلیلمنی اللوم

محبت کی خامی پختگی کے یہ مراتب قدرتی ہیں اور عام ہیں۔ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی آئے گی ان تین حالتوں میں سے کوئی حالت ضرور ہوگی۔

خام بودم، پختہ شدم، سوختم!

؎ اس آیت کے بعد کی آیت ذالک لیعلم انی لم اخنہ بالغیب الخ اور وما ابری نفسی الخ امراۃ العزیز کے قول کا بقیہ حصہ بھی ہو سکتا ہے اور حضرت یوسف کا قول بھی ہو سکتا ہے۔ سیاق بیان پہلی بات کے حق میں ہے اور بعض وجوہ و قرائن دوسری کے حق میں۔ عام طور پر مفسرین نے دوسری صورت اختیار کی ہے لیکن ہم نے پہلی کو ترجیح دی کیونکہ ظاہر سیاق یہی ہے۔

تاویلُ الاحادیث

حضرت یوسف کے حالات میں جا بجا "تاویلُ الاحادیث" کا لفظ آیا ہے۔ اور اس طرح آیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، یہ ایک علم تھا جو اللہ نے اُنہیں سکھا دیا تھا۔ پس معلوم ہونا چاہیئے کہ اس علم سے مقصود کون سا علم ہے؟

عربی میں تاویل کے معنی کسی بات کے نتیجہ اور مآل کار کے ہیں، اور باتوں کے مطلب و مقصد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۳۹ کے نوٹ میں اس کی تشریح

ع ے ترجمان القرآن جلد دوم

چکی ہے۔ "احادیث" یعنی باتیں۔ پس "تاویل الاحادیث" کا مطلب یہ ہوا کہ باتوں کا مطلب، نتیجہ اور مآل بوجھ لینے کا علم۔ یعنی انسان میں علم وبصیرت کی ایسی قوت کا پیدا ہو جانا کہ ہر بات کے مطلب اور مآل کا شناسا ہو جائے۔ معاملات کی تہ تک پہنچ جانا، امور و مہمات کے بھیدوں کا رمز شناس ہو جانا۔ ہر بات کی نبض پہچان لینی، ہر واقعہ کا مطلب پا لینا —— کوئی بات کتنی ہی اُلجھی ہوئی ہو لیکن اس طرح سلجھا لینا کہ ساری باتوں کی کل ٹھیک بیٹھ جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا ظہور کنعان کے صحرا میں ہوا تھا۔ اور ایک ایسے خاندان میں جو پشتہا پشت سے صحرا کی بدویانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیدائش سے لے کر عنفوان شباب تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی —— نہ تو کسی طرح کی خارجی تعلیم و تربیت کا موقع ملا، نہ شہری زندگی کے رسم و راہ سے آشنا ہو سکے۔ جب شہری زندگی ہی سے آشنا نہ تھے تو ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کی تمدنی خصوصیات سے کیونکر باخبر ہو سکتے تھے؟

ملکی معاملات اور انتظامی مہمات کی تو ان کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑی ہوگی۔

بسا اوقات خاندان کے موروثی اثرات، خارجی اثرات سے بے نیاز کردیتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف کا خاندانی ورثہ نبوت تھا۔ شہریاری و ملک داری نہ تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ترکِ وطنِ کنعان کے بعد سے تو شہری زندگی کا علاقہ بھی یک قلم مفقود ہوگیا تھا۔

با ایں ہمہ جب گردشِ حوادث نے انھیں مصر جیسی متمدن سرزمین میں پہنچادیا، تو وہ نہ صرف اس کے نظم ونسق کے لئے سب سے بہتر حکمران ثابت ہوئے بلکہ ان کی کامرانی و حقائق فہمی نے مملکت کو اس کی سب سے بڑی ہولناک بربادی سے بچا لیا، اور ان کے فضل و کمال کے آگے سب نے سر جھکا یا۔

خود پادشاہ وقت کو اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا پڑا ایک ایسے شخص میں جو ابھی چند سال ہوئے صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا تھا، یہ قوتِ علمی کیسے پیدا ہوگئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس

اور تمام معاملات و مہمات کی کل ہٹجانے والا ہو گیا؛ یقیناً مبدء فیاض کے کرشمۂ فیضان سے۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے؟ علمُ تاویل الاحادیث" کا سکھا دینا۔

اب جبکہ صناعی علوم کی تدوین اور فنّی مصطلحات کی بناوٹوں نے ہمیں طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لئے بہت سے مصطلحہ الفاظ بولیں گے۔ لیکن قرآن کی زبان صناعی مصطلحات کی زبان نہیں ہے۔ نہ علمی مصطلحات سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے ان ساری باتوں کے لئے ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادائے مطلب کا قدرتی اور سیدھا سادھا اسلوب ہو سکتا ہے۔ یعنی باتوں کے مطلب و مآل پا لینے کا علم۔

تعلیم کی ساری کاوشیں، تربیت ذہنی کی ساری محنتیں، تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں کس غرض سے ہوتی ہیں؟ اسی لئے کہ باتوں کا مطلب و مآل بوجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے علم و دانش کا تمام تر حاصل و مقصود کیا ہے؟ یہی کہ باتوں کی

کل بجھانی آجائے۔

جس مطلب کے لئے ہم نے بے شمار علمی اصطلاحیں بنالی ہیں، قرآن نے اسی کو بغیر کسی پیچ وخم کے اس طرح کہہ دیا جو ادائے مطلب کا ایک خاص اور قدرتی طریقہ ہو سکتا ہے اور یہ اُس کی بلاغت کی معجزانہ خصوصیت ہے۔

چونکہ حضرت یوسف نے خواب کی تعبیریں بتلائی تھیں، اس لئے مفسرین اس طرف گئے کہ یہ خواب کی سچی تعبیریں معلوم کرلینے کا علم تھا۔ بلاشبہ خواب کی بات بھی احادیث میں داخل ہے اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک گوشہ اس کا یہ بھی تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ براہ راست علم تعبیر ومنام پر اس کا اطلاق ہوا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کرلینا نبوت کے عام خصائص میں سے ہے اور ہر نبی وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خواب کی حقیقت معلوم کرلیتا ہے۔ خود حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کا خواب سنتے ہی حقیقت معلوم کرلی تھی۔ اور حضرت دانیال اور عزرا کی سرگزشتیں

ہمیں معلوم ہیں۔ پس اگر یہی بات مقصود ہوتی تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خصوصیت کے ساتھ تاویل الاحادیث کا ذکر کیا جاتا۔ یہ نبوت کے اعمال و خصائص میں سے تھی اور جب نبوت کا مقام مل رہا تھا تو لازمی طور پر اس طرح کی تمام باتوں کی قابلیت بھی مل رہی تھی۔ لیکن حضرت یعقوب نے خواب سن کر کہا۔

وکذلک یجتبیک ربک و	اللہ تجھے برگزیدگی عطا فرمائے گا
یعلمک من تاویل الاحادیث	تاویل الاحادیث کا علم سکھلائے گا
ویتم نعمتہ علیک وعلی	اور جس طرح تیرے بزرگوں پر اپنی
اٰل یعقوب کما اتمہا علی	نعمتیں پوری کر چکا ہے اسی طرح
ابویک من قبل ا	تجھ پر اور آل یعقوب پر بھی کرے گا۔

اس بیان میں برگزیدگی سے مقصود اجتبا اور تفویض ہے اور اتمام نعمت سے مقصود نبوت ہے۔ پس تاویل الاحادیث کی تعلیم سے مقصود کوئی تیسری چیز ہونی چاہیے۔ اگر تعبیر خواب ہی کی بات ہوتی تو وہ حصولِ نبوت کی بشارت میں آ گئی تھی، خصوصیت کے ساتھ الگ کر کے نہ دکھائی جاتی۔

علاوہ بریں ایک نبی کے لئے تعبیر خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ خصوصیت کے ساتھ اسے اللہ کا ایک خاص عطیہ قرار دیا جاتا۔

پھر اگر ان تینوں مقامات پر غور کیا جائے جہاں تاویل الاحادیث کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی تفصیل البیان میں ملے گی۔

عزیز مصر کا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ

عزیز مصر کا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ مفسرین کے لئے ایک حیرت انگیز معاملہ رہا ہے اور بعض مجبور ہوتے ہیں کہ طرح طرح کی دور از کار توجیہیں کریں۔

وہ کہتے ہیں، اس پر اپنی بیوی کی بد چلنی بالکل واضح ہو گئی تھی اس نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ: انه من کیدکن ان کیدکن عظیم (کچھ شک نہیں! یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے، اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں)

لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں، اس نے اس معاملہ کو اس سے
زیادہ اہمیت نہ دی کہ بیوی سے کہا: استغفری لذنبک انک
کنت من الخاطئین (اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطا
وار ہے) اور پھر اسی طرح مختار و آزاد چھوڑ دیا۔ جس طرح پہلے تھی
چنانچہ شہر کی عورتوں کی دعوت، مجلس طرب کی آراستگی اور حضرت
یوسف کی طلبی سب بعد کے واقعات ہیں۔ نیز اس کا اختیار و
تصرف اس سے ظاہر ہے کہ قید کرنے کی دھمکی دیتی ہے اور اسے
پورا کر کے دکھا دیتی ہے۔

گویا بیوی کی بدچلنی کوئی ایسی بات نہ تھی جو عزیز کو استغفری
لذنبک کہنے سے زیادہ کسی سرزنش اور مخالفانہ اقدام پر آمادہ کرتی
کیونکر ممکن ہے کہ ایک شریف اور معزز آدمی اس بارے میں اس
قدر بے حس اور بے پروا واقع ہو؟

لیکن اگر مفسرین کے سامنے اس عہد کی مصری معاشرت کی
تفصیلات ہوتیں تو اس معاملہ پر انھیں ذرا بھی استغراب نہ ہوتا۔
انھوں نے دو ڈھائی ہزار سال پیشتر کی مصری معاشرت اور اس

کے اخلاقی احساسات کو اپنے وقتوں کی معاشرت و احساسات پر قیاس کیا اور اسی کے مطابق توجیہات کے جامے تراشنے لگے۔

اس بارے میں ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔

ایک براہ راست اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا بعد کے عہدوں سے۔ پہلا اثر بیات مصر (اجپٹالوجیا) سے ماخوذ ہے، دوسرا بعض یونانی تحریرات سے۔ جو سن مسیحی سے کچھ عرصہ پیشتر لکھی گئی ہیں۔ اور یہ دونوں ذریعے اس بارے میں متفق ہیں کہ اس عہد کی مصری معاشرت کی حالت ٹھیک ٹھیک ویسی ہی تھی جس کی تصویر اس موقع پر قرآن نے کھینچ دی ہے۔

یعنی امراء کے طبقہ کی معاشرتی اور ازدواجی حالت عامۃ الناس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی عورتیں اپنے اعمال و تصرفات میں بالکل آزاد تھیں۔ مردوں کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں اُن کا پلہ بھاری رہتا۔ اخلاقی حیثیت سے معاملہ نے ایسی صورت اختیار کرلی تھی کہ عصمت دبے عصمتی کا معاملہ عملاً غیر اہم ہو گیا

ہو گیا تھا۔ لوگ سب کچھ جانتے تھے۔ اور پھر اسے ناگزیر حالت سمجھ کر
برداشت کر لیا کرتے تھے۔ گویا اس اعتبار سے، پندرہ سو سال قبل مسیح
مصری سوسائٹی کا حال ٹھیک ٹھیک ویسا ہی تھا جیسا ایک ھزار
سال بعد رومتہ الکبریٰ کے دارالحکومت میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ اور
جس کا نمونہ خود جولیس سیزر کی بیویوں کی زندگی میں ہم دیکھ لے
سکتے ہیں۔ انھیں شک وشبہ سے اس لئے بالاتر کہا گیا تھا کہ شک و
شبہ کا سب سے بڑا محل انہی کی زندگی تھی۔

دراصل یونان اور روم کا تمدّن اور بہت سی باتوں کی طرح
اس بات میں بھی بابل اور مصر ہی کے نقش قدم پر چلا تھا۔

مصر کی یہ حالت برابر رہی۔ امرأۃ العزیز کے عہد سے لے کر
کلوپیٹرا تک، وہ صرف نسوانی حسن وجمال ہی میں نہیں، بلکہ ازدواجی
زندگی کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں بھی شہرۂ آفاق
رہا۔

خود اس سرگزشت میں بھی اس کی اندرونی شہادت موجود
ہے۔ عزیز پر جب معاملہ کھُل گیا، تو جھٹ اُس کی زبان پر یے

اختیار آ گئی، غور کرو وہ کیا تھی؟

انہ من کیدکن۔ ان کیدکن عظیم

ہاں معلوم ہو گیا۔ یہ تم عورتوں کا چرتر ہے۔ تم لوگوں کے چرتر بڑے ہی چرتر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اس وقت عورتوں کی نسبت سوسائٹی کے عام خیالات کیا تھے اور کس طرح یہ بات دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مکر و فریب میں طاق ہیں ان کے فریب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو ممکن نہ تھا کہ اس موقع پر اس طرح کی بات بے اختیار عزیز کی زبان سے نکل جاتی۔

چرتر جو کچھ بھی کیا تھا اس کی بیوی نے کیا تھا تمام عورتوں نے نہیں کیا تھا۔ لیکن چونکہ وقت کی معاشرتی زندگی عام طور پر ایسی ہی ہو رہی تھی، اس لئے جب ایک عورت کا معاملہ سامنے آیا تو بے اختیار زبان سے نکل گیا ـــــ" تم سب کا یہی حال ہے۔ تمہارے مکر و فریب سے خدا کی پناہ!"

پھر بعد کو جو معاملہ پیش آیا۔ اس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ

اس بارے میں دنتن کے نسوانی اخلاق کا معیار کیا تھا؟ شہر
کی امیرزادیوں نے جوں ہی یہ خبر سُنی کہ ایک عبرانی غلام ایسا
طرح دار ہے کہ امرأۃ العزیز جان دینے لگی ہے اور وہ قابو میں
نہیں آتا تو بے اختیار اس سے ملنے کی مشتاق ہو گئیں۔ اور پھر
جب مجلس ضیافت آراستہ ہوئی اور یوسفؑ بلائے گئے تو کوئی
نہ تھا جس نے اپنی دلرُبائیوں اور شیوہ طرازیوں کے بےباکانہ
تیروں سے انھیں چھلنی نہ کر دینا چاہا ہو۔

ظاہر ہے کہ سوسائٹی کی عورتوں کا اس طرح بے حجابانہ کھُل
کھیلنا اور بغیر کسی جھجک کے ایک پورے مجمع کا اظہارِ تعشق کرنا جبھی
ہو سکتا ہے، جب کہ لکھنؤ کی اصطلاح میں "شوقینی" وقت کا
فیشن ہو گئی ہو اور شوقین عورتیں پوری طرح آزاد ہوں۔

پس عزیز کے طرزِ عمل کے لئے اس کے سوا اور کسی توجیہ کی
ضرورت نہیں کہ مصر کے ایک امیر کا طرزِ عمل کا تھا اور اسے ایسا
ہی ہونا تھا۔

اس نے بیوی کو ملامت کر دی کہ قصور تیرا ہی ہے۔ یوسفؑ سے

کہا : اس بات کو اور آگے نہ بڑھاتا، اور معاملہ ختم ہو گیا۔ اس سے زیادہ نہ تو وہ کچھ کر سکتا تھا اور نہ وقت کے احساسات متقاضی تھے کہ کرے۔

تفسیر

اِنَّ کَیۡدَ کُنَّ عَظِیۡمٌ

عزیز کے اس قول میں کہ: ان کیدکن عظیم (اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں) جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے نہ کہ دنیا جہان کی تمام عورتوں کے لئے۔

اور پھر جو کچھ بھی ہے عزیز کا قول ہے، خود قرآن حکیم کا نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس قول کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لئے یہ قرآن کا فیصلہ ہے

اور اس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکّار اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہشیار ہے۔

چنانچہ عام طور پر ہمارے مفسروں نے اس کا ایسا ہی مطلب قرار دیا ہے۔ اور پھر حسب عادت وجوہ و مباحث کی دور دراز وادیوں میں گم ہو گئے ہیں۔

پہلے اسے عورتوں کی جنس کی نسبت قرآن کا عام و مطلق حکم قرار دیتے ہیں۔ پھر حیرانی میں پڑتے ہیں کہ شیطان کے کید کو تو ضعیف کہا ہے:

ان کید الشیطان کان ضعیفا

عورتوں کا کید کیسے عظیم ہو گیا؟ پھر توجیہوں کی وادیوں میں قدم اٹھاتے ہیں اور جہاں تک نکل جا سکتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ بعضوں کو ماں لینا پڑتا ہے کہ شیطان کے کید سے بھی عورتوں کا کید بڑا ہے کیونکہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے۔ بعضوں کی دقیقہ سنجی اس پر مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں، نہیں، علی الاطلاق نہیں ہو سکتا۔ صرف جنسی تعلقات کے معاملہ میں ہے۔ اس میدان

ہیں مردان سے بازی نہیں لے جا سکتے۔

حالانکہ نہ تو قرآن کا یہ حکم ہے نہ عزیز کا قول ایسے محل میں ہے کہ اطلاق وعموم کے یہ سوالات پیدا ہوں۔ بحث و تفسیر کی یہ پوری عمارت بنیاد سے لے کر چوٹی تک بالکل بے اصل ہے۔

بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خودغرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں۔ لیکن قرآن کا یہ فیصلہ نہیں ہے اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ اور فضائل وخصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔

سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے۔ وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل ومحاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لئے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔

(للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن)

وسئلوا اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شیٔ علیما۔ ۴ : ۳۲)

چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج تبلاتا ہے۔ اسی طرح نیک عورتوں کے بھی تبلاتا ہے۔ اور جس طرح بد عمل مردوں کی برائیاں تبلائی ہیں۔ اسی طرح بد عمل عورتوں کی تبلائی ہیں۔ کہیں بھی دونوں میں کسی طرح کا امتیاز اُس نے جائز نہیں رکھا ہے، مردوں کے لئے اگر فرمایا:

" التائبون العابدون الحامدون والسائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ ط"

تو عورتوں کے لئے بھی فرمایا:

مسلمات، مومنات، قانتات، تائبات، عابدات، سائحات

منافقوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا دونوں جنسوں کا کیا۔

" المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یامرون بالمنکر وینھون عن المعروف"

مومنوں کا ذکر کیا تو صرف مردوں ہی کا نہیں کیا، دونوں کا کیا۔

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر ؕ

مردوں اور عورتوں کی یہ اخلاقی مساوات اس کا عام اسلوب ہے ہر جگہ تم دیکھو گے کہ وہ دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا، ایک ہی درجہ میں رکھتا اور ایک ہی طرح پر ذکر و خطاب کرتا ہے۔

ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحافظین فروجهم والحافظات والذاکرین الله کثیرا والذاکرات اعد الله لهم مغفرة واجرا عظیما

(۳۲ : ۳۵)

یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی مسلمہ و مومنہ ہیں۔ جس طرح مردوں میں قانت مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانتہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے

والے اور بکثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والییں اور بکثرت ذکر کرنے والییں ہیں. اور پھر جس طرح مردوں میں ایسے پاکباز ہیں کہ نفسانی خواہشوں کے غلبہ سے اپنی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی ایسی پاکباز ہستیاں ہیں جو اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ غور کرو! کسی وصف میں بھی تفریق نہیں، کسی فضیلت میں بھی امتیاز نہیں! کسی بڑائی میں بھی عدم مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو، اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بداخلاق ہے؟ اور مرد بڑے پاکباز ہوتے ہیں، مگر بدبخت عورتیں ہیں جو نفس پرست اور مکّار ہیں؟

تفسیر قرآن کی تاریخ کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک مصری بت پرست کے قول کو اللہ کا فرمان سمجھ لیا گیا اور اس سے اس طرح استدلال کیا جارہا ہے، گویا عورتوں کی جنسی پستی و بداخلاقی کے لئے کتاب اللہ کا قطعی فیصلہ موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکبازی و عصمت کے لحاظ سے دونوں جنسوں میں تفریق ہی کرنی ہو۔ تو ہر طرح کی نفس پرستیوں اور مکّاریوں کی حیوانیت مرد کے حصّہ میں آئے گی اور ہر طرح کی پاکیوں اور عفتوں کی فرشتگی عورت کے لئے ثابت ہو گی۔ یہ مرد ہی ہے جس کی حیوانیت پر عورت کی فرشتگی شاق گزرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے اسے بھی اپنے ہی طرح کا حیوان بنا دے۔ اس لئے اپنے کید عظیم کے سارے فتنے کام میں لاتا اور برائیوں کی ایک ایک راہ سے اُسے آشنا کر کے چھوڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس کے پیچھے قدم اُٹھا دیتی ہے تو اُس سے گردن موڑ لیتا ہے۔ اور کہنے لگتا ہے اس کا کید تو سب سے بڑا کید اور اُس کی برائی تو سب سے بڑی برائی ہے۔ فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد کا کید ہی ہے جو پہلے اسے اپنی کامجوئیوں کا آلہ بناتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈال دیتا ہے۔

دُنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اُسے بُرا بننے پر مجبور نہ کرتا عورت کی بُرائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو، لیکن

اگر جستجو کرو گے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا۔ اور اگر اس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا جو کسی نہ کسی شکل میں اس کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

تورات میں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوّا نے دی تھی، اس لئے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اُٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برُائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھے راہ سے بھٹکانے والی ہے۔ لیکن قرآن نے اس قصّہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی بلکہ ہر جگہ اس معاملہ کو آدم اور حوّا دونوں کی طرف منسوب کیا۔ انہیں جو حکم دیا گیا تھا وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے لئے تھا:

ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین (۲ : ۳۵)

اور لغزش بھی ہوئی تو ایک ہی طرح پر دونوں سے ہوئی:

فازلھما الشیطان عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ (۲ : ۳۶)

شیطان نے دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور دونوں کے نکلنے کا باعث

ہوا۔ یعنی جو لغزش ہوئی اس میں یکساں طور پر دونوں کا حصّہ تھا
یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ ذمہ داری ہو۔

بہرحال یہ بات یاد رہے کہ سورۂ یوسف کی اس آیت سے
جو استدلال کیا جارہا ہے وہ قطعاً بے اصل ہے اور جہاں تک
عورتوں کے جنسی اخلاق کا تعلق ہے، قرآن میں کہیں کوئی ایسی
بات موجود نہیں جس سے مترشح ہوتا ہو کہ عورت کی جنس مرد سے
فروتر ہے یا بے عصمتی کی راہوں میں زیادہ مکّار اور شاطر ہے۔

امرأۃ العزیز کا نام

زلیخا ـــــــــ ب ؟

تورات میں ہے کہ مصر کے جس امیر نے حضرت یوسف کو خریدا تھا، اس کا نام فوطی فار تھا (پیدائش ۳۷ : ۳۶) لیکن اس کی بیوی کا نام نہیں لکھا ہے۔ نہیں معلوم ہمارے مفسرین نے کہاں سے یہ بات معلوم کرلی کہ اس کا نام زلیخا تھا؟ بہر حال اس کی کوئی قابلِ اعتنا اصلیت پائی نہیں جاتی۔ البتہ مفسرین کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ اُس وقت مصر کا حکمراں خاندان عمالقہ میں سے تھا۔ یہ عمالقہ وہی ہیں جنہیں مصر کی تاریخ میں ہکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور

جن کی اصلیت یہ بتائی گئی ہے کہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ یہ چرواہوں کی قوم مصر میں کہاں سے آئی تھی؟ جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب سے آئی تھی۔ اور دراصل یہ عربی قبائل عاربہ ہی کی ایک شاخ تھی۔ قدیم قبطی اور عربی زبان کی مشابہت ان کے عرب ہونے کی ایک مزید دلیل ہے۔

حضرت یوسف کا انتقال

وصیّت

"میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا اور
میرے بزرگوں کے پاس دفن کر دینا!"

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ زندگی بھر مصر
کے حکمران و مختار رہے اور جب آخری وقت آیا تو اپنے بھائیوں
اور اپنی اولاد سے کہا: "ایک وقت آئے گا جب خدا تمہیں
پھر اسی زمین کنعان میں لے جائے گا، جس کا ابراہیمؑ، اسحاقؑ
یعقوبؑ سے اُس نے وعدہ کیا ہے۔ تو جب وہ وقت آئے تو تم میری
ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا اور میرے بزرگوں کے پاس دفن کر دینا۔"
چنانچہ ان کے خاندان کے لوگوں نے ان کی نعش میں خوشبو بھری،

اور ایک صندوق میں محفوظ کردی۔ (پیدائش۔ ۵۰: ۲۶)

خوشبو بھرنے کا غالبًا مطلب یہ ہے کہ مصریوں کے طریقہ
کے مطابق ممی کر کے رکھی گئی۔ جب چار سو برس بعد حضرت موسیٰ
علیہ السلام کا ظہور ہوا اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے
نکلے تو انھوں نے حضرت یوسف کی نعش بھی اپنے ساتھ لے لی
تھی۔ اس طرح حضرت یوسف کی وصیّت کی تعمیل ظہور میں آگئی!

تصانیف مولانا نذیر احمد و مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

مطالب القرآن	۱ — ۵۰
ادعیۃ القرآن	۱ — ۰۰
الحقوق والفرائض کامل	۱۰ — ۰۰
اجتہاد	۲ — ۵۰
ابن الوقت	۲ — ۵۰
حیات النذیر	۱۰ — ۰۰
نظم بے نظیر	۱ — ۲۵
لکچروں کا مجموعہ کامل دو جلد	۱۰ — ۰۰
عصائے پیری	۲ — ۰۰
دیوان بشیر	۲ — ۵۰
لطائف عجیبہ کامل تین حصے	۳ — ۰۰
حکایات لطیفہ " "	۳ — ۰۰
مبادی الحکمۃ	۱ — ۰۰
صرف صغیر	۰ — ۵۰
نصاب خسرو	۰ — ۵۰

رسم الخط	۰-۵۰
مایغنیک فی الصرف	۱-۰۰
نشاط عمر	۱-۲۵
بچیوں سے دو دو باتیں	۱-۲۵
منتخب الحکایات	۰-۶۲
چند پند	۰-۷۵
شمع ہدایت	۲-۵۰
انشائے بشیر	۱-۷۵
مراۃ العروس	۲-۵۰
بنات النعش	۲-۵۰
توبۃ النصوح	۲-۵۰
محصنات	۲-۵۰
رویائے صادقہ	۲-۵۰
ایامیٰ	۲-۵۰
اقبال دلہن	۲-۵۰

ملنے کا پتہ

چمن بکڈپو کلاں محل دہلی ۶

489	10.3.62		
345	9-5-63	4/4/68	19/4/68
489	22/10/63		
78	10/12/63	80 7/5/68	22/5/68
576	2/6/64		
406	26/7/64		